

مور کے پاؤں

راحت و وفا



فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
9	حرف آغاز	☆
11	راحت و وفا..... کہانوں کے جنگل میں ایک شجر وار پودا	☆
14	عزیز از جان راحت	☆
17	حسن میں پنہاں بد صورتی کی کہانی	☆
21	مور کے پاؤں	-1
40	کوڑھ کرلی	-2
56	ہنیری	-3
67	کوزہ	-4
83	چندا کے ابا	-5
100	اور بس	-6
112	چکر	-7
127	شمع باجی جیسی	-8
142	مول بن مول	-9
159	جیراں سے ماں تک	-10
171	سفید لافانہ	-11
182	اور کچھ	-12
197	دروازہ	-13

حرف آغاز

صد شکر میرے پروردگار کا جو ذہن کو جلا اور قلم کو طاقت عطا کرتا ہے، اور جس کی مرضی اور فشا کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ وہ رب کائنات مجھ ناچیز کو یہ توفیق اور جوش و جذبہ عطا کرتا ہے کہ میں قلم تمام کر کچھ لکھنے کی جسارت کرتی ہوں۔ اس جسارت کے پس منظر میں میری پیاری امی کی دعائیں ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ بالکل میرا سایہ بن کر..... کہ

میں اک دل ہوں

میری دھڑکن میری ماں ہے

زندگی کے آسمان پر

میں اک چاند ہوں

جس کی چاندنی میری ماں ہے

میں خوبصورت آنکھ ہوں

میرا نور میری ماں ہے

میں اک روح ہوں

میری جان میری ماں ہے

یہ سفر میری ماں کی زندگی سے شروع ہوا اور میرے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا
یعنی ماں کی دعائیں ساتھ ساتھ رہیں گی۔

میرے محترم قارئین جانتے ہیں کہ میں ممکنہ حد تک ان کی پسند اور ذوق مطالعہ کا خیال پیش نظر رکھتی ہوں۔ اس بار بھی نئی کتاب، بڑے اور معروف ادارے یعنی علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ علم و عرفان پبلشر کے روح رواں

گھڑا از احمد صاحب کی خصوصی توجہ اور نظر کرم کے باعث میرا تیسرا افسانوی مجموعہ ”مور کے پاؤں“ آپ کی توجہ کا طالب ہے۔ مصنف اور کتاب کے درمیان ایک اہم کردار پبلشر کا ہوتا ہے جس کی بے پناہ محبت کتاب کی صورت پر مٹے والوں تک پہنچتی ہے۔ میں دلی طور پر ممنون ہوں محترم گل فراز احمد صاحب کی جنہوں نے آپ کے لیے یہ خوبصورت کتاب پیش کی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ زیر نظر تصنیف ”مور کے پاؤں“ آپ کے ذوق معیار پر پوری اترے گی، اور میرا حوصلہ آپ کی پسندیدگی کے باعث بڑھتا رہے گا۔

میں بے پناہ مشکور ہوں، شیخ زیدی صاحب کی جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت میں سے وقت نکال کر مضمون تحریر کیا۔ حد درجہ شکر گزار ہوں رضی اللہ عنہ رضی صاحب کی جو مصروف ہی مصروف رہتے ہیں مگر انہوں نے کتاب کے لیے دیا چرچہ تحریر کیا۔ میں ممنون ہوں شاکر حسین شاکر صاحب کی جو ہمیشہ ہر ممکن مدد اور تعاون کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ انہوں نے خلوص محبت سے منفرد طرز کا مضمون بطور خاص رقم کیا ہے۔ میں بہت شکر ہے ادا کرتی ہوں۔ محترم افغانی بھائی صاحب کا جنہوں نے ہدایت و راہنمائی میں بے مثل تعاون فرمایا..... ورنہ اسے بڑے پلیٹ فارم کا مجھے خیال بھی شاید نہ آتا، اور میں بے حد خوش ہوں کہ حسب خواہش کتاب اپنے استاد ذی وقار و ذاکر انوار احمد کے نام منسوب کرنے کی آرزو پوری ہو سکی..... اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

راحت و وفا

راحت و وفا..... کہانیوں کے جنگل میں ایک شجر دار پودا

راحت و وفا کہانی لکھتی ہے۔

کہانی لکھنے سے پہلے جب اس نے بچوں کے رسائل میں کہانیاں پڑھیں تو اسے یوں محسوس ہوا کہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہر کہانی میں وہ موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح مردوں کے موسم میں لحاف کی گرمی میں بیٹھ کر وہ جب اپنی ماں سے اس کی زندگی کے دکھوں کی کہانی سنا کرتی تھی تو اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی ہر کہانی کا ایک کردار ہے۔

گرمی کے موسم میں چھت پر بیٹھے تاروں کو تکتے تکتے وہ ریڈیو سے بچوں کی باہمی سے جب کہانی سنتی تو چھوٹی چھوٹی پوئیاں باندھ کر راحت و وفا سونے سے پہلے یہ ضرور سوچتی کاش! میں بچوں کی باہمی ہوتی اور روزانہ ریڈیو پر اپنی خوبصورت آواز میں کبھی پیارے بچو! ایک تھا بادشاہ ایک تھی شہزادی.....

کہانیوں کے درمیان رہتے رہتے گڑیا جیسی راحت و وفا نے جب کہانی کے دور پر دستک دی تو جواب میں صرف ایک ہی آواز سنائی دی کہ سچے لفظ لکھنے والوں کی کہانی کو سب یاد رکھتے ہیں۔

راحت و وفا نے اس بات کو اپنے پلوں میں باندھا۔ آنکھوں میں لوگوں کے خواب سجائے ذہن میں ارد گرد کے لوگوں کے چہروں کے زخموں کو محفوظ کیا اور قراطس و قلم سے ناٹ جوڑ لیا۔ کہانی کبھی بارش بن کر اس کے آئینے میں آتی رہی، تو کبھی اس کی تکلیف بن کر اس کے دکھوں کو اپنی آنکھوں سے چھپتی رہی۔ کہانی کبھی گڑیا بن کر اسے بہلاتی رہی تو کبھی اس کو غزل نظم اور ماسیے سا کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتی رہی کہانی کبھی اس کی انگلی تمام کر میلے میں لے جا کر گم کر دیتی تو پھر راحت و وفا خود کہانی بن کر میلہ کھینچتی اور اپنی جھولی میں بہت سی کہانیاں

لے کر جب گھر آتی تو گھر میں رکھی ہوئی کہانیاں بول پڑتی ہیں کہ ابھی تو ہم نے اپنے سفر کا آغاز نہیں کیا تم مزید مٹی میں اٹی ہوئی کہانیاں کہاں سے لے آئی ہو؟ ایسے میں راحت وفا کہہ اٹھتی ہے۔

میری زندگی کہانی ہے۔

میری زندگی میں محبت بھی کہانی ہے۔

میرا آسمان، میرے بادل اور میری ہوا میں بھی کہانی ہیں۔

جب ملاج پورا دن کشمی چلا کر تھک جاتا ہے تو اس کی تھکاوٹ میری کہانی ہے۔

ریل کا انجن جب دو پیار کرنے والوں کو جدا کرتا ہے تو اس انجن کا دھواں کہانی ہے۔

گلاب کے پھولوں پر صبح سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو قوس و قزح کے رنگوں میں

ایک کہانی ہے۔

مینیجے کے آخر میں جب چاند اندھیرے کی اوٹ میں چھپ رہا ہوتا ہے تو ایسے میں

راحت وفا اس میں دھجھوٹے کی کہانی بازیاب کرتی ہے اور کہتی ہے چاند میں ہوں۔ چاندنی

میری کہانی ہے۔

راحت وفا اپنی کہانی اڑتے پرندے میں تلاش کرتی ہے تو رات کو وہ پرندہ جب

گھونسلے میں بیٹھ کر اپنے دن بھر کی کہانی اپنے ساتھی پرندے کو سنا رہا ہے تو راحت وفا پرندوں

کے دکھوں کو کہانی میں رقم کرتی ہے۔

راحت وفا کی کہانوں میں زندگی روتی ہوئی نظر آتی ہے تو کبھی عروسی جوڑا ہمیں کر

خواب دکھتی ہے اس کی کہانی میں شجر کو سایہ ملتا ہے تو پیاسے کو پانی۔ وہ اپنی کہانوں کو ختم نہیں

چھوڑتی بلکہ اپنی ہر کہانی میں خود بولتی ہے۔ اس کی کہانی اور گرد پھیلے ہوئے موسوں کی داستان

سناتی ہے وہ ہر موسم میں جا کر خزاں کے سچے جھاڑی ہے اور بہار کی کہانی کی نوید لاتی ہے۔

اس کی کہانی میں اگر کہیں آنسو ہیں تو وہ آنسو اپنے دکھوں سے نکلیں گے۔ اسی وجہ سے وہ

اپنے دکھوں کو کہانی میں لکھتی ہے کہ لوگوں کو بتا سکے کہ دکھوں کی فصل وہ اکیسے نہیں کاٹ رہے

بلکہ وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہے۔

راحت وفا کی کہانی کیا ہے؟

یہ سوال ہم ایک دوسرے سے اس لیے کر سکتے ہیں کہ وہ گزشتہ کئی سالوں سے کہانی

کی بہت کر رہی ہے بالکل ایسے جیسے کوئی ٹوکی سوئیٹر بننے والی سلاسیاں ہی اس کا اوزار چھوٹا ہے وہ اگر ناول لکھتے تو کہانی لکھتی ہے۔ کالم لکھتے تو کہانی لکھتے ہیں۔ کالج میں کلاس کو لیکچر دے تو اپنی کلاس کے ہر بچے کے چہرے پر ایک نئی کہانی تلاش کر لیتی ہے اور

کہہ اٹھتی ہے کہ میری کلاس کے اگر نہیں بچے ہیں تو ہر پچہ روز ایک ایک کہانی لے کر کلاس میں

آتا ہے۔ ایسے میں راحت وفا جب لیکچر دے کر گھر لوٹتی ہے تو کہانوں کے بوجھ کی تھکن اس

کے چہرے پر عیاں ہو جاتی ہے اور وہ تھک ہار کر جب بستر پر جاتی ہے تو سوچ اس کی آنکھوں

میں سیرا کر کے کہتی ہے کہ کہانی لکھنا اتنا آسان نہیں۔ اسی سوچ میں کم ہو کر جب وہ خوابوں کی

داوی میں جاتی ہے تو پھر خواب اسے کہانوں کی ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں ہر الف لیلہ

کی کہانیاں لے کر اسے کہتی ہیں۔ راحت وفا! تمہاری زندگی کہانی میں اس لیے بس رہی ہے کہ

تم اپنی کہانوں میں خود رہتی ہو۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لوگ کہانی لکھتے ہیں اور پھر یہ معلوم نہیں

ہوتا کہ کہانی کا پہلا سرا کہاں ہے اور آخری لائن کیا کہہ رہی ہے؟ راحت وفا کہانی لکھنے والوں

کے جہنم میں وہ قلم کار ہے جس نے کاغذ کو کیوں نہ جانا۔ اپنے لفظوں سے تصویر بنائی اور پھر کہانی

کے نام پر ایسی مصوری کی کہ اس کی کہانی میں کہیں صادقانہ دکھائی دیا تو کسی کو گل جی کی یاد

آئی۔ بس میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ راحت وفا کی کہانی مصوری، موسیقی اور خوشبو کی یاد دلاتی

ہے۔ اسی لیے میں نے مضمون کے آغاز میں لکھا ہے کہ سچے لفظ لکھنے والوں کی کہانی ہمیشہ امر

رہتی ہے۔

لکھتی رہو، اور لکھتی رہو کہ اسی میں کہانی کی بقاء ہے۔

شاہد حسین شاہد

عزیز از جان راحت

نازمین کی ادارت سنبھالنے کے بعد پہلی بار راحت و قاف سے ٹیلی فون پر ریکی بات چیت ہوئی جو ایک ایڈیٹر کی اپنی ماسٹر سے ہوتی ہے کچھ دھندے کچھ مہم دیوان، قلمی تعاون کے حوالے سے ہماری گفتگو میں زیر بحث آئے اور اسی ماہ راحت و قاف نے اپنا تازہ افسانہ بھیج دیا اور یوں نازمین کی ٹیم کا حصہ بن گئیں پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ راحت کے لکھنے کا سلسلہ دیگر رسائل اور جرائد میں تو پہلے سے تھا مگر نازمین کے لیے انہوں نے خصوصی طرز پر جب جب ہم نے کہا تو لکھا اور خوب لکھا، راحت کا ایک بڑا پیارا اور دوستانہ اسٹائل ہے "اور میری جان میرے لائق کوئی خدمت" ان کے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی میں انہیں افسانے کی ذمہ داری سونپ کر خود بے فکر ہو جاتی کیونکہ مجھے معلوم ہے وہ انتہائی ذمہ داری سے یہ فریضہ انجام دے کر مجھے سرخرو کر دیتی ہیں۔

راحت کو قریب سے جاننے والے مانتے ہیں کہ ان میں اپنے نام کی دونوں صفات شامل ہیں۔ دوسروں کے لیے راتیں، سکون اور سر میں طشاش اور دوستوں کے لیے رواداری، محبت اور حد سے زیادہ وفاداری جیسے اصولوں کی پاس داری ان کی شخصیت کا اہم جزو ہے وہ اس بے مہر اور سخت ناسنے میں بھی دوستوں کے لیے نرم خو ہیں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک بعض اوقات کسی تخلیق کار کو زور دینا پڑتا ہے مگر راحت کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے اسی بنا پر وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے ایسے رازوں کو بے نقاب کرتی دکھائی دیتی ہیں جو عام آدمی کی نظر سے اوجھل ہیں یا وہ جان بوجھ کر ان سے نظریں جڑاتا ہے۔

راحت ریت پر گھر و بندے نہیں بناتیں بلکہ کچی اینٹوں سے اپنے افسانوں کے کرداروں کی بنیاد رکھتی ہیں اور پھر اس پر کل تعمیر کر دیتی ہیں اپنے کرداروں کو جادوئی انداز سے

لے کر چلتی ہیں اس طرح کر اگلے کردار کو جس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے اسے بھی اصل حقیقت کا علم نہیں ہوتا جنہوں نے ان کے افسانے پڑھے ہیں وہ اس بات کو زیادہ بہتر سمجھ پائیں گے۔ "مور کے پاؤں" میں شامل سب افسانے، ہمیری، کوڑھ کرلی، کوڑھ چندا کے ابا، جبرائیل سے ماں تک، شمع باجی جیسی، اور کچھ، مول بن مول، سفید لٹافہ، چکر سب کے سب اپنے کرداروں کے اعتبار سے ڈرامائی اور حقیقی دونوں طرح سے ترجمانی کرتے ہیں۔۔۔۔۔

علمی و ادبی حلقوں میں راحت و قاف کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت کم عرصے میں اپنی شناخت بنائی ہے تخلیق کے سفر میں اکثر مقام ایسے آتے ہیں جب خواہش بہت بار جاتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ تو یوں بھی مردوں کا معاشرہ ہے اور ایسے میں خود کو سنانا جان جو کھوں کا کام ہے ہماری سینئر لکھاریوں نے بے شک راہ کے کانٹے اپنی پلکوں سے جن کرکھی لکھنے والیوں کے لیے راستہ آسان بنایا ہے مگر اپنی محنت سے تحقیق کے بیج بونے کے بعد محنت ادب میں جن مصنفین نے قارئین کو اپنی بہترین تحریروں سے مالا مال کیا ان میں راحت کا نام سرفہرست ہے بہت کم عرصے میں ادب کی مختلف جہتوں میں مستحکم اور مستقل حراستی سے ڈٹے رہنا اور اعتماد سے آگے بڑھنا راحت ہی کا کمال ہے۔ تخلیق کی ساری پرتوں میں انہوں نے اپنے کرداروں کو کردار نگاری اور اس کی جزئیات کے ساتھ زندہ رکھا ہے پھر ہر افسانے یا ناول میں کرداروں کا بچھم دکھانے کے بجائے مخصوص مگر مضبوط کرداروں کو ان کی زبان و بیان کی صحت کے ساتھ اس طرح دکھانا کہ پڑھنے والا خود کو اس منظر نامے کا حصہ سمجھنے لگے راحت کا وصف ہے وہ جب کوئی کردار تخلیق کرتی ہیں تو منظر نامے میں اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتی ہیں ایک ماہر اور شائق پروڈیوسر کی طرح وہ ہر کردار پر نظر رکھتی ہیں اس کے حصے کی اینٹنگ اور ڈائلاگ ڈیورس تک اس مہارت سے ادا کرتی ہیں کہ پڑھنے والا اس میں رچ بس جاتا ہے۔۔

رہی کے بھاد بیچنے نکلے ہوئے ہیں لوگ

یہ زندگی پڑھا ہوا اخبار ہی تو ہے

راحت کے کریڈٹ پر بے شمار خوب صورت افسانے ہیں جو ادبی فن پارے ہیں مگر یہاں ان کے تیسرے افسانوی مجموعے "مور کے پاؤں" میں شامل، اور خصوصی طور پر ان کے افسانے، ہمیری، کوڑھ کرلی، اور کچھ، سفید لٹافہ، دروازہ کا بند کرنا چاہوں گی

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے اور اس کے قوانین بھی ظاہر ہے مردوں ہی نے وضع کیے ہیں وہ عورت کی مصیبت اور وقار داری کو کھلنا سمجھتے ہیں اس کے جذبات سے بھیلے ہیں۔ اپنی حرص و ہوس اور مغالہ کی آڑ میں اس کی ہستی کو زمانے کی نظروں میں مستتب بھی قرار دیتے ہیں۔ مرد کی بے رحمی کا شکار ہونے والی عورت کا احوال راحت کے افسانوں کی پہچان ہے۔

”مور کے پاؤں“ اپنے نام کی طرح خوبصورت طلسماتی کہانیوں پر مبنی کتاب ہے۔ جس میں راحت نے معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کر کے دراصل افسانوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ اس آئینے میں اگر کسی کو اپنی تصویر یا عکس دکھائی دیتا ہے تو اس میں راحت کا قصور نہیں راحت کو دیکھ کر، اس کے مضبوط ارادوں کو جان کر صرف یہی کہنا کافی ہوگا۔

اس شہر کی گلیوں میں صدا کر کے تو دیکھو

یہ دم فقیری بھی ادا کر کے تو دیکھو

رہ جائے گی ہر بات تمہاری بھی ادھوری

تم خود کو کبھی مجھ سے جدا کر کے تو دیکھو

راحت کو معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں اور کہانیوں سے جدا کیا ہی نہیں جاسکتا جب تک راحت کے ہاتھ میں قلم ہے چٹائی یوں ہی پھیلے گی کہ اسے اور دامن ادب یوں ہی بھر رہے گا اگر راحت جیسی تخلیق کار کھتی رہیں گی، یہ قول راحت لکھتا ”ہمارا کام ہے اس کی اچھائیوں، برائیوں کو احاطہ تحریر میں لانا بھی ہمارا کام ہے اور ہم اس پر کام کرتے رہیں گے“ اس امید کے ساتھ۔

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر

ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

شع زیدی

مور کے پاؤں.....

حسن میں پنہاں بد صورتی کی کہانی

شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین کی تعداد میں کیوں واقع ہو رہی ہے اور ادب ہماری ترجیحات میں کیوں شامل نہیں رہا؟ یہ وہ سوال ہے جو گزشتہ چند برسوں سے ادبی حلقوں میں تواتر کے ساتھ زیر بحث ہے۔ ہم اس سوال پر تفصیلی بات بھی کرتے ہیں، مختلف اسباب پر روشنی بھی ڈالی جاتی ہے لیکن قاری کو دوبارہ ادب کی طرف واپس لانے کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں ہوتی۔ آبادی اور شرح خواندگی میں اضافے کے باوجود ادبی کتب اور رسائل و جرائد کی اشاعت میں اضافہ نہیں ہوا۔ آج سے بیس برس پہلے جو کتاب جس تعداد میں شائع ہوتی تھی آج بھی اس پر وہی تعداد اشاعت درج ہے۔ کتابیں اور رسائل ہزار، پانچ سو اور اکثر اوقات دس سو سے زیادہ شائع نہیں ہوتے۔ اس ساری صورتحال کی ایک وجہ بلاشبہ مہنگائی بھی ہے۔ کاغذ اور طباعت کے اخراجات میں اضافے نے کتاب کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ بہت سے لوگ خواہش کے باوجود کتابوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شہر میں کتابوں کی دکانیں تو رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں لیکن فوڈ سٹریٹس کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس باپوں کی صورتحال میں امید کی ایک کرن وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں ہم ڈائجسٹوں کو قاری کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہونے والے یہ ڈائجسٹ عوامی حلقوں میں اب بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والے ادب کے معیار پر بات ہوتی رہتی ہے۔ یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ ان ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریروں کا شمار ادب میں ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ معیار جو بھی ہو،

ڈانجھوں میں شائع ہونے والے مواد کی ادبی حیثیت ہو نہ ہو، لیکن ایک بات پر بھی متفق ہیں کہ یہ ڈائجسٹ لفظوں کے ساتھ لگوں کے ٹوٹنے ہوئے تعلق کو برقرار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ مطالعہ کا جو رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے وہ ان ڈائجسٹوں کی بدولت اب بھی برقرار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ڈائجسٹ لکھاریوں کی ایک نئی کیپ بھی سامنے لارہے ہیں۔

ڈائجسٹوں نے سب سے زیادہ فروغ فکشن کو دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان ڈائجسٹوں کی مقبولیت ہی ان میں شائع ہونے والے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے ہے۔ طویل سلسلہ وار ناول، ناولٹ اور افسانے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور اگلے شمارے کی اشاعت تک قاری کی دلچسپی بھی برقرار رکھتے ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوں کے مصنفین کو ادبی حلقے تسلیم کریں نہ کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ڈائجسٹوں میں چھپنے والے لکھاری ”سہ بند ادیبوں“ کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوتے ہیں اور ان کے قارئین کا حلقہ بھی ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلا ہوتا ہے۔ راحت دفا ایسی ہی ایک مصنفہ ہیں جوگزشتہ کئی برسوں سے ڈائجسٹوں کے لیے ناول اور افسانے تحریر کر رہی ہیں اور ان کا شمار مقبول قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ ناول، افسانے اور کالم نگاری میں ان کا ایک اپنا اسلوب اور شناخت ہے۔ ڈائجسٹوں کے قارئین کو ان کی تحریروں کا خصوصیت کے ساتھ انتظار رہتا ہے راحت دفا کا تعلق مٹان کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد شمسٹ دفا مرحوم کا شمار مٹان کے ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مہر قلم کی حرمت کا تحفظ کیا۔ راحت دفا نے کافد اور قلم سے وابستگی کے ماحول میں آنکھ کھولی اور کم عمری میں ہی افسانے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

جنوبی پنجاب کے مرکزی شہر مٹان میں اگرچہ قدم قدم پر کہانیاں موجود ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ اس شہر کا ماحول افسانے کے لیے کبھی بھی سزاگار نہیں رہا۔ یہاں شاعری تو ہمیشہ چمکی پھولی لیکن کوششوں کے باوجود مٹان میں افسانے کو پینے کا موقع نہیں ملا۔ 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں ڈاکٹر سلیم اختر اور مسعود اشعر نے مٹان میں قیام کے دوران یہاں افسانہ نگاری کے فروغ کے لیے متعدد مجرہ کوششیں کیں۔ ان کے اس شہر سے رخصت ہونے کے بعد افسانے کی آبادی کا کام ڈاکٹر عرش صدیقی، ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر انور زاہدی نے جاری رکھا لیکن پھر بھی مٹان میں راولپنڈی، لاہور اور کراچی کی طرح نئے افسانہ نگاروں کا ظہور نہ ہوا۔ 80ء کی دہائی میں چند نوجوانوں نے خود کو افسانے کے ساتھ وابستہ تو کیا لیکن وہ

اس معیار کے افسانے تحریر نہ کر سکے جو کئی سطح پر ان کی پذیرائی کا باعث بنے۔ کہنے کو ان میں سے کچھ نے افسانوں کے ایک سے زیادہ مجموعے بھی شائع کرائے لیکن ان مجموعوں میں اور تو سب کچھ موجود تھا مگر افسانہ یا کہانی کسی کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی۔

خواتین قلمکاروں کا جو حلقہ اس دوران افسانے اور کہانی سے وابستہ رہا اس میں شمر بانو ہاشمی، نوشاہہ نرگس، غزالہ خان کوٹلی اور خود راحت دفا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان خواتین قلمکاروں نے اپنے افسانوں میں عورت کے مسائل کو موضوع بنایا اور جنوبی پنجاب کے جاگیردارانہ سماج میں عورت کے ساتھ روار رکھے جانے والے مظالم ان کی کہانیوں کے ذریعے منظر عام پر آئے۔

”مور کے پاؤں“ راحت دفا کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے اور دیگر مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والے ان کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ مور کے پاؤں حسن میں پنہاں بدصورتی کی علامت ہیں۔ کہنے کو یہ ایک افسانے کا نام ہے لیکن حقیقت میں یہ عنوان راحت دفا کے افسانوں کی مجموعی فضا کی عکاسی کرتا ہے۔ روایت ہے کہ حسن کی علامت مور جب رقص کے دوران اپنے پیروں کی جانب دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے ہیں۔ وہ اس کے باوجود رقص جاری رکھتا ہے اور رقص کے ذریعے وہ سرت تلاش کرتا ہے جو اسے بدصورت پیروں کے دکھ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ راحت دفا نے اپنے افسانوں میں جامعاً عورت کے دکھوں کو بیان کیا ہے۔ عورت اس دنیا کا حسن ہے لیکن اس حسن کے ساتھ کہیں نہ کہیں کوئی بدصورتی بھی وابستہ ہے۔ راحت دفا اپنے قاری کو اس بدصورتی سے بے نیاز کر زندگی کے سن سے خوشیاں کشید کرنے کا درس دیتی ہیں۔

راحت دفا نے زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور اپنے گرد و پیش میں موجود بہت سی کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ زندگی کے دکھوں کو کتنی ہی ہیں اور ان دکھوں کو اپنے افسانوں کے ذریعے قاری تک کچھ اس انداز میں پہنچاتی ہیں کہ پڑھنے والا بے ساختہ داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ معاشرتی زندگی کے بہت سے تضادات ان افسانوں کے ذریعے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ عورت کو انا کی بھینٹ یا دفا کی بھینٹ کیسے چڑھایا جاتا ہے؟ یہ ان افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ ان افسانوں میں عورت کے کئی روپ ہیں۔ وہ دفا شعار عورت کے طور پر بھی سامنے آتی ہے اور بے وفائی کرنی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں محبت

ستائیسواں سال لگا تو بوڑھے والدین کی راتوں کی نیند اڑ گئی، تن تہا زرد روشنی

راحت و فکا کے افسانے حقیقت کے قریب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سور کے پاؤں ایک حقیقت ہیں یا جیسے ی حسن میں کہیں نہ کہیں بد صورتی کی موجودگی ایک حقیقت ہے۔ راحت و فکا نے زندگی کی سطح حقیقتوں کو اسے فکا کی بنیاد بنایا ہے انہیں معلوم ہے کہ خواب محض خواب ہوتے ہیں اور ان کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ قاری کو خوابوں کی دنیا میں لے جانے کے بجائے حقیقت سے روشناس کراتی ہیں اور حقیقت خوابوں کے مقابلے میں بہر حال بہت سطح ہوتی ہے۔

رضی الدین رضی

پھیلائے والے بلب کو گھورتے گھورتے صبح ہو جاتی تو وہ چور نظروں سے اُن دونوں کو بھیجتی۔ مگر اُس کے پاس اُن کے سنانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا، اُن کی فکر پریشانی کا اصل سبب تو وہی تھی۔ اماں دے دے لہجے میں اکثر ابا کو کہتی ”دقت تیزی سے نکل رہا ہے اب تک بھول کے کوئی ہمارے دروازے پر نہیں آیا“ ایسے میں ابا کو کبھی کبھی پگ پگ جانی بھی اماں کو ماننے کے لیے طویل کھانسی کا دورہ شروع کر دیتا کہ اماں بھاری اُن کی پیچھے تھینکتے اور اپنی پلانے میں لگ جاتیں یوں ابا اطمینان کا سانس لیتے۔ مگر انھیں اپنی اگلی بیٹی کی فکر اندری اندر چاٹ رہی تھی اصل پریشانی کی وجہ صباحت کی باتیں ناگہ کا چھوٹا ہونا تھا وہ پیدا ہوتی طور پر تو ایسی تھی جس، چار سال کی عمر میں ابا کی سائیکل کا ایک گاڑی سے ایک ہی منٹ ہوا تو اُس کے نیچے پر شدید چوٹ آئی کہ فہم غریب ابا کو پہلو اُن کی سوجھی، جنہوں نے اپنے دیکھنے والی سرخروں سے شدید نقصان پہنچایا، جب ہسپتال تک پہنچے تو کافی خرابی ہو چکی تھی، آپریشن ہوا ناگہ ٹھیک ہو گئی مگر جانے کیوں اُن کی آزمائش کے لیے ناگہ چھوٹی پڑ گئی جس سے وہ جھٹکا کھا کر اور ڈک ڈک کر چل سکتی تھی..... بچپن کا یہ صدمہ جوانی تک پہنچنے پر بہت بڑا عیب بن گیا، دیکھنے سے پہلے ہی لوگ معذرت کر لیتے..... ایسے ایسے کن موقع پر کسی نے تین بچوں کے باپ عظیم احمد کا بتایا تو ابا کی مرضی معلوم کے بتایے اماں نے مگر صاف ستر کر کے بڑے تکلف چائے کا اہتمام کر ڈالا۔ اُس کے اور ابا کے لیے ایسے میں کچھ کہنے سننے کو نہیں رہا تھا، عظیم احمد شریف انٹنس، وزندہ دل اور دوجہ عمر کے انسان تھے، بس ابا سے عمر کی منزل طے کرنے میں چند قدم پیچھے ہوں گے۔ ایک ٹیکسٹائل فیکٹری میں کواٹری کنٹرول آفیسر تھے، بیوی بچوں کے ہمراہ آئے تھے، سات سالہ مصیب، نو سالہ ذہیب اور گیارہ سالہ شعیب خاصے ٹھٹ ٹھٹ اور بد تیز تھے مگر بد جیسی بتائی گئی کہ اماں کے نہ ہونے سے بچوں پر اثر پڑا ہے۔ اماں نے فہم کو عظیم احمد کی اس بات سے اتفاق کر لیا۔ بڑے تکلف چائے کے بعد اماں نے صباحت کے متعلق بتایا انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوا وہ تو ہر بات بس اوکے کر کے رخصت ہو گئے..... اماں بہت خوش تھیں جبکہ باورچی خانے میں اندر سے آنے والے چائے کے برتن دھوئی صباحت کے چہرے پر بے بس سرچستی خاموشی تھی اور آنکھوں میں بھاری گی کی نمی، ابا نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُسکے متاثرہ دیکھ کو ہاتھ سے پکڑ کر کہا.....

”کچھ دیر کو میری بیٹی خود کو مور سمجھ لے۔“ اس کے بعد وہ اٹھ کر باہر چلے گئے اور صبح بچ اُس نے خود کو مور ہی سمجھ لیا، ماں باپ دونوں پر نظر ڈالے خوشی سے تاپنے لگی.....

عظیم احمد کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے اُس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور تہیہ کیا کہ اس گھر کی خوشی، عزت میں اضافہ کرے گی، ماں سے محروم بچوں کو ممتا کا حقیقی احساس دے گی۔ مگر عظیم احمد نے روڈ فائی میں انگوٹھی دینے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو پاس بٹھا کر اُس سے عہد لیا کہ وہ ہر صورت بچوں کا خیال رکھے گی، اُس نے گردن جھکا کر عہد کی یقین دہانی کرا دی..... عظیم احمد خوشی سے کھل اٹھے اور بچوں کو اپنے سے لگائے کرے سے باہر نکل گئے..... باہر جا کر وہ شاید بھول گئے کہ کوئی اندر اُن کا منتظر ہے۔ جب انہیں بچوں کو سنانے کے بعد فرصت ملی تو کمرے میں واپس آئے اور دیکھا سرخ پڑوں میں لپٹی وہ کسی گھڑی کی مانند بیڑ پر سوئی ہوئی تھی وہ خاموشی سے صبح کر کے خود بھی سو گئے۔ یوں روڈ فائی میں انگوٹھی مانتے کی میز پر اُنھوں نے جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔ بچوں نے بڑے تجسس سے سرخ مٹکی ڈیبیہ کی طرف دیکھا اور پھر مصیب نے سوال کر ڈالا ”پاپا! کیا ہے؟“

”رنگ ہے بیٹا، جلدی جلدی ناشتہ ختم کر دو یہ مور ہی ہے۔“ عظیم احمد نے کہا اور خود بھی جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگے۔

رات سے یہ دوسرا موقع تھا جب اُس نے جان لیا تھا کہ عظیم احمد کو بیوی کی نہیں، بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اچھی آیا کی ضرورت تھی، جو اُس کی شکل میں پوری ہو گئی تھی، اُن کے جانے کے بعد نارنجی دھبہ لگے دوپٹے میں آنکھوں سے ٹوٹنے والے موتی بھی سجالے اور صبرِ شریٰ سل تمام تر جذبات پر رکھ دو جیج کیزر ٹیکر بن گئی، سب کا خیال، سب طرح سے رکھنا..... مگر اس پر بھی بچے ناخوش رہتے..... اسکی نقیصے اُتارتے، خاص کر اسکی ناگہ پر نظر کرتے۔ اُس کے بنائے ہوئے کھانوں میں عیب تلاش کرتے، عظیم احمد کو کچھ بچوں کا رویہ نامناسب لگا تو اُنھوں نے سمجھانے کی کوشش کی..... وہ نرم خُو انسان تھے کبھی شید اور تلخ لہجے کا سہارا نہیں لیتے تھے..... اس لیے بچے اپنی روش پر قائم تھے، ویسے بھی اُن کو پروگرام تو اپنی حقیقی ماں ممتاز سے بذریعہ فون، روز روز ملاقات پر ملتا تھا، ہر روز مستقل فون کا کرنا بچوں کے معمولات میں شامل تھا کافی کافی دیر وہ اپنی ماں سے باتیں کرتے رہتے، مگر یہ متعلق، صباحت سے متعلق اطلاعات فراہم کرتے، نمک مرچ لگا کر بتاتے، صباحت سب کچھ سننے کے باوجود خاموش رہتی۔ اماں ابا کو با عظیم احمد کو بتا کر مگر مریض خرابیاں پیدا کرتی تھیں۔ اس لیے خاموشی بہتر تھی۔ ایک روز اُس کی بڑداشت جواب دے گئی اُس نے اپنے کانوں سے شعیب کو

فون پر اپنی ماکو یہ کہتے سنا کہ۔

”اما! ہم اس ٹکڑی بلا کو نکال کر دم لیں گے، پایا ہمارے لیے بہت اچھے ہیں۔“
صباحت سر سے ہر تک شلک اٹھی اُس نے شعیب کو تو کچھ نہیں کہا البتہ شام کو عظیم صاحب کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے شکایت کر رہی تھی۔ وہ اُس کی بات پر نہ جوئے، نہ آگ بکولہ ہوئے، چپ چاپ کھانا کھاتے رہے تو اُسے بہت حیرت ہوئی پھٹ پڑی۔

”گویا شعیب نے ٹھیک کہا۔“

”میں نے ایسا کب کہا ہے؟“ وہ قدرے نرمی سے بولے۔ ”آپ نے غلط بھی

کہاں کہا ہے؟“

”شعیب کا یہ رویہ عجیب ہے کبھی میرا کہ قدرتی طور پر وہ ایسا سوچتے ہیں ختم اُن کی ہلکی ماں نہیں ہو یہ حقیقت تو ہے نا۔“ وہ حلق سے کہہ کر کھانے کی میز سے اٹھنے لگے تو وہ محل کر بولی۔

”اس کا مطلب ہے مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں! اگر شعیب، مصیب اور زہیب کی ماں کو اپنے بچوں کا خیال ہوتا تو۔“
وہ بالکل سادگی سے کہہ کر بیڑوم کی طرف چلے گئے اور وہ میز پر سر رکھ کے بھوٹ بھوٹ کے رو دی۔

روٹی روٹی ٹوٹی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر عظیم احمد کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ اُس نے گرم دودھ کا گلاس اُن کی ٹیبل پر سامنے رکھا تو اُنھوں نے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا اور اُس کا ہاتھ تمام کر سامنے بٹھالیا۔

”صبحات! میں سر سے ہر تک تمہارا احسان مند ہوں ختم نے میرے آجے گھر کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے، میری اور میرے بچوں کے لیے تمہاری خدمات کا کوئی بدلہ نہیں ہے، مجھے معلوم ہے بچے تمہارے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں، ماں کی ماں نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ختم نے آکر خالی گھر بھر دیا وہ اب بھی بچوں کے ذریعے دراصل مجھے ہی پریشان کرنا چاہتی ہے، مگر میں اس کا اثر نہیں لیتا، کبھی تو بچے سمجھ جائیں گے۔“ پلیز بہت ادرکس۔“

اور یہ سن کر ساتھ چھوڑتے صبر و تحمل کو مضبوط ہاتھوں سے جکڑ لیا، اور عظیم احمد کے

لیے اور زیادہ خوشی اور اطمینان کے طریقے اختیار کرنے لگی۔ زندگی تو اب عظیم احمد کے ساتھ ہی بسر کرنی تھی، وہ شاعری کا سبق تو ماں کی لوریوں سے زیادہ اُس کے کانوں نے سنا تھا اس لیے وہ وہ شاعری تو کسی طور نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس لیے بچوں کی بھی ہر حرکت خاموشی سے برداشت کر لیتی۔

اس وقت بھی وہ اُن کے کمرے میں جمناک کر خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی۔۔۔۔۔ آج رات کے آٹھ بج گئے تھے مگر عظیم احمد ابھی تک نہیں آئے تھے وہ اس شش و پنج میں تھی کہ کیا بچوں کے لیے کھانا لگا دے یا عظیم صاحب کا انتظار کرے۔ خیر اُسی وقت گاڑی زبکے کی آواز آنی ٹیکسری کی گاڑی عظیم احمد کو چھوڑ کر گئی تو اُسے حیرت ہوئی۔ اپنی گاڑی لے کر گئے تھے۔ وہ جو بھی کمرے میں داخل ہوئے تو اُن کے ہاتھوں میں دو تین بڑے بڑے پیکٹ تھے۔ جو اُنھوں نے سنٹر نیبل پر رکھ کے جلدی سے کہا۔

”صبحات! عظیم! جلدی سے ایک کھول کر نکالو، خراب ہو جائے گا، اور ہاں بچوں کو بھی نکالو۔“ اُس نے ایسا ہی کیا۔ باورچی خانے سے بڑی پلیٹ، بھری، کانٹے بچھ اور چھوٹی پلیٹیں لے آئی۔ اُس کے بعد بچوں کو نکالنے لگی، اُنھوں نے دھاوا بول دیا، اور اُن دونوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چٹ ہو گیا۔ عظیم احمد صبحات سے نظریں ہڑانے لگے۔ بچے باپ کا جینک پو کہہ کر باہر چلے گئے، تب صبحات نے گندی پلیٹیں، بچے اچھے کئے اور باہر جانے کو موزی تو عظیم احمد بولے۔

”صبحات! یہ ہماری شادی کی سالگرہ کا ایک تھا، تم بھول گئی ہو آج کا دن پر میں نہیں۔“ صبحات کی آنکھیں ڈکھ سے ڈبڈبائیں۔ کتنی سادگی سے وہ اُسے شادی کی سالگرہ کے ایک کے متعلق بتا رہے تھے۔ جسے اُس نے چھٹا تک نہیں، کا کا تک نہیں، بلکہ خود عظیم احمد نے بھی ہاتھ نہیں نکالنا اور وہ اُسے یاد دلارہے تھے۔

”اس عکس کی بھی کیا ضرورت تھی؟“ بابا باغیچہ زبان پر آگیا

”ارے بس یہ تو بچوں کو خوش کرنے کا بہانہ ہوتا ہے، دیکھا نہیں تینوں کے چہرے؟ خوشی سے کھل رہے تھے۔“ عظیم احمد نے اپنی ترنگ میں کہا تو وہ تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔ باورچی خانے میں رتن دھوئے ہوئے مسلسل اسکی آنکھیں برقی رہیں۔ مگر اُس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے صبر شکر ہی مانگا۔ اور کھانا گرم کر کے میز پر لگایا، سب کو اطلاع دی۔ عظیم احمد

کھانا کھاتے ہوئے بغور اسکی طرف دیکھتے رہے وہ کھانا کھا نہیں رہی تھی بلکہ کہیں اور ابھی ہوئی تھی۔ تب وہ ایک دم اُسے متوجہ کرنے کو بولے۔

”تیکم ابھی غم نے پُچھا ہی نہیں گاڑی کہاں ہے۔؟“

”پاپا! پھر خراب ہوگئی ہوگی۔“ زوہیب نے منہ ہانک کر کہا۔

”اسی لیے پاپا نے نئی گاڑی بک کرانی ہے، اسی بٹھے آجائے گی۔“

علیم صاحب نے کہتے ہوئے صاحت کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ علیم صاحب مطمئن ہو گئے کہ صاحت انفرود نہیں ہے۔ ویسے بھی انہیں اسکی طرف سے پورا اطمینان تھا کہ وہ بہت صابر شاکر صلح پسند فطرت کی مالک ہے۔

بستر پر لیٹ کر اُسے خود سے قریب کرتے ہوئے انھوں نے بولنا شروع کیا۔

”صاحت! تجھیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اور بچے کس طرح واپس زندگی کی طرف لوٹے ہیں۔ ممتاز جس نے مجھ سے محبت کی شادی کی تھی پھر وہ میری جان کے درپے آگئی تھی۔ مجھ سے طلاق لینے کے لیے آخری حد تک گئی، اُس نے کھلے لفظوں میں مجھے زہر دینے کا اعلان کر دیا تھا، میری محبت، بچوں کا خیال وہ اپنے سے کم غر مہائے کے بیٹے عامر کے باعث بھول گئی، اُس نے محبت کے نام پر ایسا شرناک کھیل میرے گھر میں کھلایا کہ محلے داروں نے، میرے دوستوں نے اُسے طلاق دینے کے لیے مجبور کیا۔ وہ ایک ایسی عورت بن چکی تھی جس کے جذبات کی تسکین عامر جیسے کم غر نو جوان کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اپنے تین حرف لکھ بیچھے اور کہہ دیا کہ آج کی رات ہے تمہارے پاس جو چاہو اس گھر سے لے جاؤ، میرے بچوں کے سوا..... صاحت! اُس نے ایسا ہی کیا، وہ سب کچھ، ہاتھ، پاؤں لے گئی۔ گھر میں تھماؤ بھی نہیں چھوڑی۔ اگلی صبح جب میں نے گھر میں قدم رکھا تو گھر میں صرف یہ تینوں بچے بھوکے پیاسے اور سبے ہوئے بیٹھے تھے، میرے گلے لگ کر مکتوت پُٹ کے روئے وہ پہلا موقع تھا جب میں خود بھی رو دیا تھا، ورنہ شاید اپنے ماں باپ کی وفات پر بھی دل ہی دل میں سسکیاں بھری تھیں مگر اولاد کا دکھ محسوس کر کے میرا دل پہلی بار زنجی ہوا تھا۔ میرے پاس غر مگر بھی جمع پونجی جانے کے بعد یہ تین بچے ہی بچے تھے میں نے ان کے لیے پھر سب کچھ سنے سرے سے بنایا، انھیں وہ سب کچھ دیا جو پہلے گھر میں موجود تھا..... یہاں تک کہ ان کو اپنی ماں سے خالہ سے ملنے کی اجازت تک دے دی.....

عورت عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے یہ میں نے غم کو پانے کے بعد جانتا ہے۔ غم نے کبھی کوئی ذمہ داری نہیں کی کبھی اپنی جائز خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا۔“ وہ درادیر کوڑکے تو صاحت نے خود وہ کہہ دیا جو شاید وہ سنا چاہتے تھے۔

”وہ سب کچھ تو ہے میرے پاس، مگر بچے، شوہر، مگر میں موجود ہر آسائش، اور کیا مانگوں؟“ علیم احمد بخوم اٹھے اُسے اور زیادہ قریب کر لیا..... یہ جانے چکا کہ غیر ارادی طور پر اُسکے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے.....

اماں سے ملنے کی تو گود میں سر رکھ کے ٹکڑہ کر دیا۔

”میرے لیے غم نے اچھا نہیں سوچا شاید۔“

”جیس! یہ غم شک کر رہی ہوا اپنی ماں پر۔“

”اماں! تمھیں نہیں معلوم میں شک اور یقین کے درمیان کتنے سر پاؤں پکڑا

رہی ہوں۔“

”اللہ نہ کرے تمھارا گھر آباد ہے، سہاگ سلامت ہے، کیسی بد بھگونی والی باتیں کر رہی ہو۔“ اماں کو دبا دبا اشتعال آگیا۔

”ہاں! علیم احمد کا گھر آباد ہے۔“ وہ دکھ سے کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اماں بڑی دیر اُسے بھلاتی رہیں۔ مگر وہ غم غم نہیں رہی، رات علیم احمد آ کر اُسے لے گئے۔ راتے بھر وہ انھیں خوش رکھنے کو ہنسی مسکراتی رہی۔ علیم احمد نے بڑی اچھی جگہ سے اُسے آئس کریم کھلائی، مینھا پان کھلایا۔ وہ اُن کی اس محبت اور توجہ سے ہی اپنا سارا غم بھول گئی۔ بچوں کے لیے بھی آئس کریم لی اور گھر آ گئے۔ علیم احمد نے تمنا ہی پا کر اُسکے ہاتھ پُچھ لیے اور کہا۔

”میں تمھارا احسان مند ہوں، غم نے میرے گھر کو جنت بنا دیا ہے، ورنہ اُس عورت نے تو اجاڑنے پر بارکد نے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ وہ یہ سن کر قسلی آئینہ نظروں سے انھیں دکھ کر مسکرا دی۔

اگلے دن وہ ابھی دوپہر کا کھانا پکا رہی تھی کہ علیم احمد بچوں کو لے کر وقت سے پہلے آ گئے تو وہ تھمیری ڈسٹر سے ہاتھ صاف کر کے کوئی کچن سے باہر نکلی، بچے اچھلتے کودتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے جب کہ علیم احمد اسکی حیرت کا اشارہ بھانپ کر اُس کے قریب آ گئے.....

”خیریت“ وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں! وہ دراصل ان کی ماں کا فون آیا تھا، وہ لاہور سے آئی ہوئی ہے، بچوں کو کچھ وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔“

”اور آپ نے اجازت دیدی۔“ وہ مزید حیرت سے بولی۔

”ہاں! بچوں کو اسی لیے تو سکول سے جلدی لایا ہوں۔“ وہ بڑے نارمل انداز میں بولے ”اور آپ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو ملنا چاہیے؟“

”دیکھو! صباحت اٹھ جس انداز میں یہ سوچ کر پڑھ رہی وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ممتاز بچوں کی ماں ہے، میں سخت گیر باپ بن کر بچوں کی خوشی میں حائل نہیں ہو سکتا۔“ انھوں نے بڑی روانی سے اپنی کرداری کا اعتراف کر لیا، تو صباحت کو ہلکا سا دکھ بھر افسوس آ گیا۔

”میں، کیا ہوں؟“

”ختم ختم صباحت ہو! دنیا رو بہت کاروبار، اس گھر کو آباد کرنے والی۔“ عظیم احمد بڑی وارفتگی سے بولے۔

”لیکن شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں۔“ وہ اداس لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

پھر عظیم احمد بچوں کے تیار ہونے پر انھیں ماں سے ملنے کے لیے چھوڑنے لگے تو وہ دیکھی دُور سے دُور سے دل کے ساتھ سارے گھر میں غیر ارادی طور پر چکر لگانے لگی۔ اُس کے اندر خوف ہی خوف پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ عظیم احمد ٹھیک نہیں کر رہے۔ یہ گھر کی آسودگی سے سکونی میں نہ بدل جائے، اور یہی، تو عظیم احمد بچوں کو چھوڑ کر گھر آگئے۔ وعدے کے مطابق ممتاز نے بچوں کو رات سات آٹھ بجے خود چھوڑنا تھا۔ اس وجہ سے عظیم احمد بے فکر ہو گئے اُس نے کھانا لگا دیا تو انھوں نے خوشگوار منوؤں میں کھانا کھایا۔ پھر کمرے میں سو گئے شام کو اُٹھے تو صباحت نے جانے لا کر دی انھوں نے چائے پی اور پی وی آن کر لیا۔ صباحت نے فرصت سے ان لمحات میں بھی اپنے لیے مصروفیت و غصہ کی کپڑوں کی الماری کی صفائی کی کپڑوں کی ٹھیک سے تہ لگائی۔ اس کے بعد مغرب کی اذان ہو گئی۔ عظیم احمد نماز کے لیے باہر چلے گئے۔ اور وضو کر کے نماز پڑھنے ہی والی تھی کہ فون کی ٹھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے جانے نماز رکھ کر فون اٹھانے کے لیے رسیدر اٹھایا۔

”عظیم احمد کو بتا دو، بچے صبح آئیں گے۔“ ایک اجنبی سپاٹ آواز میں کہا گیا، اور

فون بند ہو گیا۔ صباحت کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اُس نے نماز پڑھی اور پی وی لاؤنچ میں بی بیجھ گئی۔ عظیم احمد آئے تو اُس نے لفظ بہ لفظ فون والی بات کہ دی۔ عظیم احمد پُچھ سے ہو گئے۔ اُس نے انھیں سمجھنے کے لیے غور سے دیکھا مگر وہاں خاموشی تھی۔

شاید آپ اپنے لیے ٹھیک نہیں کر رہے۔“ وہ خود بولی۔ تو وہ ہنس دیئے۔

”کچھ نہیں ہوتا، بچے ہیں، صبح آجائیں گے، دُور سراسر مدد کی ہے بچوں کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

اُس نے اُن کی بات پر مزید کچھ اور نہیں کہا۔ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ مگر ساری رات عظیم احمد کی کرکٹوں کا اضطراب اُسے یہ بتاتا رہا کہ وہ بچوں کی وجہ سے مضطرب ہیں۔ اپنے سے الگ بھی کچھ نہیں کر سکتے ہی تھے پہلا موقع تھا کہ وہ گھر سے باہر تھے۔ رات بھر سو نہ سکے، صبح بھی جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ صباحت نے اُٹس جانے کا یاد دلایا تو تیار ہونے چل دیئے۔ وہ اُن کے لیے ناشتہ بنا کر میز پر رکھ رہی تھی کہ باہر گیٹ پر رکشہ رکنے کی آواز آئی۔ کچھ ہی دیر میں تینوں بچے اندر آگئے۔ اور خوشی خوشی وہ چیزیں دکھانے لگے جو ماں لاہور سے لائی تھی۔

”یہ دیکھیں پاپا! یہ میری لیڈر جیکٹ، یہ میری کمپیوٹر ٹیم، یہ میرے شوز دیکھیں۔“ وہ تینوں ہی ایک ساتھ بول رہے تھے۔

”سب اچھے ہیں، مگر یا آپ لوگوں نے وعدہ خلافی کی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ مصیب نے پوچھا۔

”آپ نے رات کو آنا تھا۔“

”وہ ممانے روک لیا تھا، رات بہت مزہ آیا، ہم نے خوب سیر کی۔“

زودیب نے بتایا۔ عظیم احمد خوش ہو گئے، اور بے فکر ہو کر ڈیوٹی پر چلے گئے۔ مگر دن بھر بچے اُس کو ڈیوٹی ازیت پہنچاتے رہے۔ بات بات پر اپنی ماما کی تعریف اور اُسکی ٹھیک کرتے رہے۔ طعنے دیتے رہے۔ مصیب نے تو باقاعدہ یہ تک کہہ دیا کہ ”آپ ہمارے گھر سے جاؤ۔“ صباحت چوٹکی یہ بات مصیب کے ذہن میں کیسے آئی؟ اُس نے کمال ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

کچھ دن سے اُبا کی بیماری کی اطلاع تھی مگر وہ خیریت معلوم کرنے نہیں جا سکی

تھی، رات کھانے کے بعد اُس نے عظیم احمد سے چلے کو کہا تو وہ راضی ہو گئے اور بلکہ بچوں کو بھی ساتھ چلے کو کہا جس پر شعیب نے ناک منہ چڑھا کر کہا۔

”ہم کیوں جائیں ان کے گھر، یہ کیا لگتی ہیں؟“

”شعیب! کیا زبان چلا رہے ہو اندازہ ہے مجھ۔“ عظیم احمد کو خود بہت برا لگا صباحت کی تو شرمندگی کے احساس سے آنکھیں پھر آئیں۔

”یہ ہماری خاموشی ہو سکتی بس۔“ وہ بیاد بختی سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ ”آپ لوگوں کو شرمندہ ہونا چاہیے، یہ سنا آپ کا خیال رکھتی ہیں، آپ کی مما جس انداز سے آپ کو چھوڑ کر گئی تھیں وہ یاد کرو۔ اب انھیں آپ کا خیال آ گیا ہے۔“ عظیم احمد پہلی مرتبہ خاصے ترش لہجے میں بولے، صباحت کا مودخت آف ہو گیا جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا، کرے میں چلی گئی، لیکن عظیم احمد نے آکر چلنے کے لیے اصرار کیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اس واقعے کا اثر ہفتہ بھر اُس کے ذہن پر رہا وہ ہنسی بھٹی ہوئی رہی، بچے فخر کرتے، ناک منہ چڑاتے مگر وہ بھر بھی مسکرا کر اُن کے کام کا جن میں مصروف رہتی، نسبت سے متعلقوں پر تو عظیم احمد خود شرمندہ سے ہو جاتے مگر کہتے کہ نہیں یا شاید اُن کے پاس کہنے سننے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ بس اکثر دوشیزہ وہ اُس کو تیلی اور حوصلہ دے دیتے۔ اُس کے لیے وہ بھی کافی تھا۔

موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، چار پانچ دن ہسپتال میں داخل رہتے ہوئے فوت ہو گئے، وہ بھٹ بھٹ کے روٹی آپ اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا، بیٹے کی آس عورت کو مرنے تک قوت دیتی ہے، وہ بالکل ہی بے بس سی ہو گئی۔ عظیم احمد اُس کے غم میں برابر کے شریک رہے، یقیناً وہ فتنہ کے سب فرائض انھوں نے ہی ادا کئے۔ وہ چار دن اماں کے پاس رہی، پانچویں دن وہ بھیگ انھوں کے ساتھ اماں کو تنہا چھوڑ کے عظیم احمد کے ہمراہ گھر آ گئی۔ تو حیرت و افسردگی کا ذوقی صدمہ لگا۔ مگر کی حالت ناقابل بیان تھی۔ گندے برتن کی دی لالچ اور ڈرائنگ روم میں پڑے تھے۔ اُس سے پہلے عظیم احمد نے بچوں سے پوچھا۔

”یار ایہ کیا حالت بنا رکھی ہے مگر کی، اسنے گندے برتن تک تو سب ٹھیک تھا۔“

”وہ ماما اور صائمہ خالہ آئیں تھیں، تو ہم بس نے مل کر کھانا بنایا تھا۔“ شعیب نے

بڑے ناراض انداز میں جگر جگر چپاتے ہوئے بتایا۔

”کب؟ میرے جانے کے بعد۔“ عظیم احمد نے تعجب سے پوچھا۔

”جی یا پاپا میں نے انھیں بلایا تھا، کیونکہ آپ گھر میں ہوتے تو ہمیں چھوڑ آتے۔“

شعیب نے فوراً وضاحت پیش کر دی۔ تو عظیم احمد سر جھٹک کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور وہ غمزدہ صفائی ستھرائی میں، برتن سیکنے میں بٹ گئی۔ کافی دیر بعد کمرے میں پہنچی تو عظیم احمد کی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے پایا۔ دوسرے سے پوچھا تو وہ سرد ملی ہی آہ بھر کے بولے۔

”میں سوچ رہا تھا کہ یہ وہی گھر ہے جہاں ممتاز دھن بن کر آئی تھی، جانتی ہو اُس نے مجھ سے شادی خوشی کی دھمکی دے کر کی تھی، میں لاہور میں چند مہینے اُس کے گھر پرے انگ گیسٹ رہا تھا، اور ممتاز کے بقول وہ مجھے شدت سے چاہنے لگی تھی، یوں میرے انکار کے باوجود میں اُس کے بوڑھے کلک باپ کی گزارشات مسترد نہ کر سکا میرا کھانا تھا نہیں، چند دوست تھے جنھوں نے مجبور کیا اور ممتاز یہاں آ گئی، سوچتا ہوں اُسے یہاں سے جانے کے لیے بھی ذہنی دھمکی دینی پڑی فرق صرف اتنا تھا کہ دوسری بار اُس نے مجھے زہر دینے کی دھمکی دی، وہ ہی دوست میرے سامنے آ گئے اور کہنے لگے کہ

”جب عورت اپنی آئی پر آ جائے تو اُس کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے۔“ وہ ذرا دیر کوڑکے تو صباحت نے سوال کر دیا۔

”پھر آپ راستے سے ہٹ گئے، اب وہ کیوں آپ کے راستے میں آنے لگی ہیں؟“

”بیچے تو ہیں نا۔“

”اُس وقت بھی تو یہ بیچے تھے۔“ صباحت کی زبان کی نوک پر پانچک کا نانا نکل آیا۔

”چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔“ وہ بیکر ٹال گئے۔

”آپ کو کوئی ملال ہو رہا ہے۔“

”میں اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتا ہوں اُن کا احساس محرومی مجھے ملال کے

ساتھ اور بھی بہت کچھ دیتا ہے۔“ وہ تنبیہ سے کہہ کر بستر پر دروازہ ہو گئے۔ صباحت کی آنکھوں سے انجانے خوف و سہم نے نیند کھج کھج کر نکال دی۔..... رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی، جبکہ اُس کے قریب ہی عظیم احمد گہری پرسکون نیند سوئے ہوئے تھے۔

جب سے اُس کے ہا فوٹ ہوئے تھے اسے اتناں کی تنہائی کی فکر کھائے جاتی تھی، اُس نے اور عظیم احمد نے انھیں اپنے ساتھ رہنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ تیار نہ

کہتے نہ تھے۔ خود سے پُچھنے کی اُس نے کوشش نہ کی وہ فیکٹری جاتے، واپس آتے، وہ معمول کے فرائض ادا کرتی اور بس..... اُن کے اندر کیا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟ اس کا اُسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر شعیب نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

”میری مہربانیاں ہی رہیں گی، اور ہم اُن کے ساتھ رہیں گے۔“

کمرے کی بے ترتیب چیزیں سمیٹتے ہوئے وہ چونکی۔ شعیب، ذہیب اور صیب کے ٹکائے پر کمرے سے باہر چلا گیا وہ کافی دیر کمرے کی شعیب کے شیلے پر غور کرتی رہی۔ شام کو اُنہاں آئیں تو اُس نے اُن سے اپنے سب جمع شدہ شکوے گلے بیان کر دیے۔

”مجھے کہیں اور قربان کر دیتیں۔“

”آہ میری پاگل بیٹی قربانی کے لیے محنت، خوبصورت جانور خریدے جاتے ہیں تیرا عیب زمانے والے بچپانے کو تیار نہیں تھے۔“

”تو میرا گلا دبا دیتیں۔“ وہ رو دی۔

”تجھے غم کیا ہے، سب کچھ تو اللہ نے دیا ہے، مگر گاڑی، روپیہ پیسہ شوہر اور“

”اور پرانے بچے۔ یہی کہتا ہے۔ نا۔ اُنہاں اِکھول ہے تمہاری میرے پاس سب سے زیادہ خوف و غم ہے۔“ وہ تقریباً چلا پڑی ”کس بات کا خوف؟“ اُنہاں نے گزیرا۔

”کچھ نہیں، بس سب ٹھیک ہے۔“ وہ ٹال گئی۔

”علیم احمد نے کچھ کہا کیا؟“

”علیم احمد تو بند کسا ہے۔“ وہ زخمی سی ہنسی ہنس دی۔

”مرمت کروا کر وہ اللہ اپنی اولاد دے گا تو۔“ اُنہاں کے لبوں سے الفاظ جھین لیے اُس نے جس میں ماپوی اور بے دلی شامل تھی۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ کیوں؟ اُنہاں کو اُس کے یقین پر اعتبار نہ آیا۔ ”کیونکہ اس گھر میں،

میری جگہ ہی مشکل سے نکلی ہے۔“ وہ دکھ سے کہہ کر خاموش ہو گئی..... اُنہاں نے اُس کی باتوں سے کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا، مگر وہ کی کیفیت میں چھوڑ کر وہ اکیلی صبح ہی چلی گئیں۔ علیم احمد ٹیکوی جاتے ہوئے اُنہیں ساتھ لے گئے، تاکہ راستے میں چھوڑے ہوئے اُسے چلے جائیں گے، جاتے وقت بھی اُنہاں اُسے آنکھوں آنکھوں میں بہت سی تسلیاں دے گئیں۔ مگر دل کو دھڑ

کا سا لگا تھا۔ علیم احمد کی خاموشی بوجھ تو نہیں تھی، بوجھ وہ جانے کو ہے تب بھی مگر سوچ ہی نہیں مل رہا تھا۔ شام کو وہ جلداری آئے تو وہ کمرے میں آ گئی۔ اُس کی طرف دیکھ کر وہ بولے سے سُکرا کرے تو اُس نے تھک کر سلپر اُن کے پیروں کی طرف بڑھا دیے۔ تیزی سے بائے بائے کرتے ہوئے چلے گئے۔ صباحت نے جا کر گریت بند کیا اور بی لاؤنچ میں ہی بیٹھ گئی۔ علیم احمد کچھ دیر اُس کا انتظار کرنے کے بعد وہیں آ گئے۔ اُس کے قریب بیٹھ کر بولے۔

”تنتنی ادا سی ہو گئی ہے بچوں کے جانے سے۔“

”بھجوری آپ بچوں کو جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔

”بھجوری ہے، ماں سے ملنے کے لیے روک کر بچوں کو باغی بنانا نہیں چاہتا۔“

اُنہوں نے سر تھکا کر اپنی کمروری کا اعتراف کر لیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے اندر چلی گئی۔

پھر مین ہوا کہ ایک اینڈ کے بعد بھی بچے چلے بھانے بنانا کرفون کے ذریعے نہ آنے کا کہتے رہے۔ علیم احمد سے ہی بات کرتے تھے اور وہ اجازت دے دیتے تھے۔ صباحت نے کسی قسم کی مداخلت کرنی بالکل چھوڑ دی تھی۔ بس گھر کی دیرانی اُسے پریشان کرتی تھی۔ مگر اُس کا اظہار وہ علیم احمد سے نہیں کرتی تھی..... کچھ محسوس کر کے علیم احمد نے چونکدار کا بندوبست کر دیا، اس طرح وہ کچھ خود کو مطمئن محسوس کرنے لگی، لیکن چار پارچے روز گزرنے کے بعد جب بچے نہ آئے تو علیم احمد کو اچھا نہ لگا۔ بچوں کی شعیب کا فون آیا اُنہوں نے کافی سختی سے اُس کو فوراً واپس آئے کو کہا، ”پاپا! جلیز دو دن بعد آ جائیں گے۔“ اُس نے منت کی۔

”یار! آپ کو احساس ہے کہ سٹریز کا کتنا نقصان ہو رہا ہے، کسی کے گھر میں اُس طرح پڑھا جاسکتا ہے، اور آپکے خیال یہ کچھ۔“ وہ خاصے برہمی سے بولے۔

”پاپا! ماما بھی تو ہمارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“ شعیب نے اچانک ایسی بات کہہ دی

جس پر وہ جھڑک اُٹھے۔

”یہ جھوٹ ہے وہ آپ کو ضروری سمجھتیں تو چھوڑ کر ہی نہ جاتیں، اس لیے فوراً واپس آ جاؤ۔“ فون بند کر کے علیم احمد سر گری کی پشت سے لگا کر گری سوچ میں ڈوب گئے، کپ اٹھا کر لبوں سے لگا یا..... وہ پہلی بار انہیں اس قدر متشکر دیکھ رہی تھی۔

”آپ اُنہیں خود بچوں سے ملنے سے منع کر دیں۔“

”رات بھر جاگنا اور سوچنا مشکل کام ہے۔“ انہوں نے کراہتے ہوئے اپنی سوچ اور مشکل کی وحدانی تصویر پیش کر دی۔

”آپ مجھے کیا لگے۔“ وہ وفا شعار بیوی کے انداز میں اس خٹلے کے ساتھ ہی اُن کے دل کو چُوم گئی تو وہ درد سے منسکرا دیئے۔

”اگر تم جاگ جاتیں تو شاید تمہارا چھوٹا سادماغ اُس درد کی شدت کے آگے خود بخوش کر لیتا۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“

”کچھ بھی ہے فی الحال چائے اور گولیاں لے آؤ۔“

دو اثبات میں سہرا لگے باہر نکل گئی۔ کچھ منٹوں میں اُس نے بوتل کے جن کی طرح ناشتہ چائے سردی گولیوں اُن کی خدمت میں پیش کر دیں اُس کے بعد انہوں نے اُسکی توجہ بچوں کی طرف مبذول کرادی اور وہ اُن کا ناشتہ بنانے، انہیں چکانے کے خیال سے پھر باہر نکل آئی۔

اُس روز عظیم احمد نے فیکٹری سے چھٹی کی اور ہسپتال پر لینے رہے صباحت بار بار اُن کا حال معلوم کرنے جاتی تو انہیں کھلی آنکھوں سے کچھ سوچنا پائی۔ ایک دوسرے پہ چھٹا چاہا تو وہ ٹال گئے۔ اُس کے بعد اُس نے خاموشی اختیار کی، کمرے سے باہر نکل آئی اور اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ عظیم احمد کی طبیعت بحال ہوئی تو وہ تیار ہو کر کہیں باہر چلے گئے۔ وہ بھی مطمئن ہو گئی۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا وہ اتناں کو ملنے نہیں گئی تھی۔ اس وجہ سے اتوار کو اُس نے عظیم احمد سے اجازت لی تو وہ بولے۔

”ہاں! ضرور چلی جانا، بلکہ میں بھی چلا ہوں، لیکن پہلے بچوں کو ان کی ماں کے پاس چھوڑ آؤں۔“ تو اسے جھکا سا لگا۔

”آج بھر۔“

”آج بھر سے کیا مطلب، جیسی ماں سے بچوں کا تعلق آج اور کل کا نہیں ہوتا۔“ عظیم احمد نے کچھ عجب سے لہجے میں جواب دیا تو اُس کے دماغ میں ایک ٹیس دی اٹھی، بے دلی سے گردن اثبات میں ہلا دی۔ عظیم احمد بچوں کو تیار کر کے

”وہ بہت ضدی عورت ہے، اور زیادہ بچوں کو باغی بنا دے گی۔“

”بچوں کو بھی سمجھا دیں۔“

”بچے تو بچے ہیں، ماں اُن کے لیے بہت اہم ہوتی ہے، نہیں معلوم وہ کیا چاہتی ہے؟“ سچ منہ حار میں چھوڑ کر جانے والی کو اس وقت بچوں سے زیادہ اس گھر کی چیزیں اہم لگی تھیں۔ جہاڑ دیک نہیں تھی اس گھر میں صرف دُکے سبے بچے تھے۔

عظیم احمد کے دل سے اٹھتا دھواں چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ میں شامل ہو رہا تھا..... وہ ماضی کی تلخ یادوں میں خود کو تلاش کر رہے تھے صباحت نے دھیرے سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے اُس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ کے اطمینان بھری سانس لی اور چائے پینے لگے۔

پھر تقریباً گھنٹے بعد رکشہ گیٹ پر رُکا اور بچے آگے نگران کے منہ بھولے ہوئے تھے چہرے پر لگا ہوں میں غصہ اور تلخی کی غفلت تھی..... کھانے کی میز پر بھی تینوں میں ایک بھی نہیں آیا۔ اس بات پر بھی عظیم احمد کو سخت تشویش ہوئی۔ وہ خود اُن کے کمرے میں کھانا لے کر گئے، صباحت نے خاموشی سے اپنی پلیٹ کا کھانا ختم کیا اور برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں چل گئی۔ تنہا دھوئے، باورچی خانہ صاف کیا، پھر کمرے میں آگئی عظیم احمد کے لیے کپڑے منتخب کر گئے۔ رکشے۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی وہ کمرے میں نہیں آئے تو وہ ہسپتال پر لپٹ گئی، جھکن سے پُورے جسم چند ساعت میں ہی نیند کی وادیوں میں چلے گیا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب عظیم احمد کمرے میں آئے اور کب سوئے؟ وہ بھی عظیم احمد کا کاج میں مصروف رہتی تھی اس لیے نیند گہری آئی تھی، گو کہ صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے ایک ماسی آتی تھی، مگر دوسرے تمام کام کھانا پکانے سے لے کر کپڑے استری کرنے تک وہ خود ہی کرتی تھی..... ایسی مصروفیت میں ایک لمحہ بھی اُسے آرام کا نہیں ملتا تھا۔ عظیم احمد ہمیشہ اُس سے پہلے سوتے تھے، آج رات پہلا موقع تھا کہ وہ اُس کے بعد سوئے، لیکن صبح اٹھنے پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں تھے، بلکہ بہت مضطرب اور پریشان میں جا گئے رہے تھے، اس وجہ سے صبح اُن کی آنکھیں سُجی ہوئی تھیں، سر میں درد تھا، وہ نماز پڑھ کے کمرے میں جا بنے لگی تو انہوں نے آواز دی۔ ”صباحت! ایک کپ چائے اور سردی گولیوں لے آؤ، ورنہ نہ سہرت جائے گا۔“

”خیریت! آپ کی تو آنکھیں سُرخ ہیں۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

انہیں چھوڑنے گئے۔ پیچھے سے وہ تیار ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ آگئے اور اسے لے کر چھوڑنے چلے گئے۔ وہاں اماں کو بخار تھا تو اس نے رات اُن کے پاس رہنے کی اجازت لی جو کہ انہوں نے خوشی سے دی۔ اس کے بعد وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے۔ واپسی پر پھل، گوشت، سبزیاں لے کر آئے۔ صباحت کا دل بھر سکون و اطمینان کے احساس سے بھر گیا۔ وہ چلے گئے۔ وہ پوری طرح اماں کی تہہ درباری میں لگ گئی۔ گھر کی صفائی کی، کھانا پکایا۔ اماں کے لئے بخنی بنائی اور بھران کی پٹی سے لگ گئی۔ اگلے دن عظیم احمد کا انتظار کر رہی تھی کہ اماں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”جراثیم دی کے انتظار میں چہرہ زرد، مُر جھائے ہوٹ اور دھندلی پچھلیاں ہو جاتی ہیں۔“ وہ چونکی اور بولی۔

”اماں! مجھے تمہاری بات پر حیرت ہے۔ عظیم احمد کے ساتھ بھیجے ہوئے تو تم نے یہ نہیں سوچا تھا۔“

”سوچا بھی تھا اور سمجھا بھی تھا مگر کوئی اور راستہ نہیں ملا تھا۔“ وہ مایوسی سے کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

”بس پھر میرے چہرے کو غور سے بھی نہ دیکھا کرو، کیونکہ میں بندگی میں ہوں۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں بول گئی۔ اماں کا دل کٹ سا گیا مگر اپنی آنکھوں پر فونی کھڑے کر دیئے۔ رات ہو گئی عظیم احمد اُسے لینے نہ آئے، وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور پھر سب دروازے بند کر کے لتاں کے ساتھ ہی لگ کر سو گئی۔ اگلے دن دس بجے کے قریب عظیم احمد آئے، انہوں نے ٹچلٹ ظاہر کی، وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ لتاں نے دُعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ گاڑی کچھ دور نکلی تو اس نے بُو چھپی لیا۔

”آپ رات۔“

”آئے نہیں کیوں؟ یہی بُو چھتا ہے نا۔“ اُس کا تھلہ اُچک کر وہ خود بولے۔

”شاید۔“

”ایک مشکل میں گرفتار تھا، فیصلے کی سولی پر چڑھا تھا۔“ انہوں نے گاڑی کی رفتار ذرا کم کرتے ہوئے کہا۔ تو اس نے ترجیحی نگاہ سے دیکھا۔

”پھر فیصلہ ہو گیا۔“

”ہاں۔“

”اللہ اچھا کرے۔“ ایک دم دھڑکتے دل کے ساتھ اُس نے بے ساختہ کہا تو گاڑی کے ٹائر چر چر کے قوت سے چیلے چلائے اور بریک پر پاؤں رکھ کے عظیم احمد اپنا چھلا ہونٹ کاٹنے لگے۔ محظربانہ انداز میں اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ مروڑنے لگے۔

”کیا ہوا؟“

”صباحت! تمہاری دُعا سچی اور معصوم ہے مگر یہ شاید کسی اور کے لیے قبول ہو گئی ہے۔“ وہ جڑو سے بولے۔ تب وہ ڈکھ سے مسکرا کر بولی۔

”کہتے ہیں کہ اللہ معذور کی دُعا کان لگا کر سنتا ہے، اُس کا شکر ہے کہ دُعا پہلے ہی قبول ہو گئی۔“

”صباحت! میں نے بڑی مجبوری میں ایک فیصلہ کیا ہے، ہمتاؤ کو دوسرے شوہر سے طلاق ہو چکی ہے، وہ دوبارہ رشتہ بحال کرنا چاہتی ہے، بھسورت دیگر بچوں کو اُسے دینا ہوگا، کیوں کہ وہ تمہا ہو گئی ہے۔ بچے یہاں دُسر پر رہیں گے۔“ وہ بھلائے، رُکے مترندہ سے بُوئے مگر اتنا ہی کہہ پائے تھے وہ بولی۔

”آپ مشورہ مانگ رہے ہیں یا فیصلے کی اطلاع دے رہے ہیں۔“ وہ انتہائی ضبط سے بولی۔

”بہ مشورہ ہے اور نہ مجبور ہے، بس مجبوری ہے۔“

”مجھے لکھنا آتا ہے، جو لکھنا ہو، جب لکھنا ہو بتا دیجیے گا، آپ کا بھروسہ ٹوٹنے نہیں پائے گا۔“ اُس نے پانی کی بوتلوں میں بھرے اس تھلے سے نیٹ کچھ لکھ کے انہیں پیش کر دیا۔ اور عظیم احمد بھی لکھائی کا پڑھنے کی ناکامی کو شش کر کے اُسے ایسے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ جبکہ وہ استانی مشیرہ آپا کے خملے کی بازگشت کانوں میں سُن رہی تھی۔



نے حکم کی تعمیل کی اور گاڑی سڑک پر جمع گندے بدبودار پانی کے حوالے کر دی مگر میں اسی جگہ پر ڈاکٹر حماد احمد نے گاڑی روکنے کو کہا اور دائیں طرف نظر آنے والی تنگ تاریک سی گلی کو گھورنے لگے۔ گل باز نے گاڑی روک کے دائیں بائیں چلتے پھرنے والوں کو دیکھا جو دکائیں، کھوکھے نظر آئے انہیں گھورا اور پھر پرانے بوسیدہ جھکے ہوئے مکانوں کو دیکھا جن سے قدامت سے زیادہ غربت جھانک رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ بھلا شہر کے سب سے بڑے گانا کالوجسٹ کو یہاں کیا کام؟ یہاں تو ان کے جانے والا ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید بے شمار بے اولاد یہاں رہتے ہوں مگر ڈاکٹر صاحب کی فیس اور علاج معالجے کا بوجھ اٹھانے والا یہاں کوئی نہیں ہو سکتا۔ میری تو اپنی گھر والی کو چھوٹے ارپاز کی پیدائش کے بعد مسئلہ ہوا تو اس کے کہنے پر وہ کچھ دیر ہنستا رہا پھر بولا۔

”ہونہ“ اوقات میں رہ! تیرے جیسوں کے لیے سرکاری ہسپتال ہیں۔ تو تو ڈاکٹر صاحب کے ہسپتال کا نام لینے کی بھی طاقت نہیں رکھتی۔“ اس پر اس غریب نے دل سے یقین کر لیا تھا اور خاموش ہو گئی تھی۔

”بس! بس سبلی گئی ہے تم یہیں ٹھہرو۔ میرا انتظار کرو۔“ ڈاکٹر حماد احمد نے کچھ خوش سے کہا اور خود ہی دروازہ کھول کے گندے پانی میں چلتے ہوئے گلی کی تاریکی میں گم ہو گئے کچھ ڈوران کی دائیں ہاتھ کی اٹھلیوں میں دبا سا گراہ دکھانے والے جگنو کی طرح گل باز کو بھی نظر آتا رہا پھر کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں تک تو گل باز کی نگاہوں نے کام کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس گل میں جانے والا کوئی انجینی اور انجان نہیں تھا۔

گل باز کو معلوم نہیں تھا کہ یہ گلی، اس کی گلی اور تاریکی حماد احمد سے مانوس تھی یا حماد احمد کے قدم یادوں کے نشانات پر چلتے ہوئے انہیں مہر کی چوکت پر لے جائیں گے۔ انہیں ذرا سا بھی دروازے پر انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور کھٹ سے پرانا ٹکڑی کا دروازہ کھلے گا۔ مہر دسر پر دوپٹا جاتے ہوئے سرکرائے گی۔ مگر آج ایسا نہیں ہوا وہ مہر کے دروازے پر تھے، وہی ہماری بے رنگ ٹکڑی کا دروازہ تھا، وہی باہر پرانی زنجیر والی کنڈی تھی جس پر آخری مرتبہ ان کے تقریباً بیس سال پہلے ہاتھ لگے تھے، اے اختیار ہو کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھول کے دیکھے اور پھر دایاں ہاتھ کنڈی کی طرف پڑھایا تو سسکی ہوئی جھجھلاہٹ پیدا ہوئی جو انہیں شرم سا رکھتی۔

کڑھ کرلی

بڑے لوگوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ برداشت کر لیں تو بڑی سے بڑی بات برداشت کر لیں اور نہ کرنا چاہیں تو کسی کی معمولی سی آنے والی جینک پر بھی پیشانی ٹھنک آلود بنائیں۔ ڈاکٹر حماد احمد بھی ایسے ہی بڑے لوگوں میں شامل ہوتے تھے، دل چاہا تو گردن میں لوہے کا سربا کھڑا کر لیا اور چاہا تو موم کے قالب میں ڈھل گئے۔ مگر اس وقت تو وہ کسی اور ہی دنیا کے ہاں نظر آ رہے تھے سکوت اور اضطراب دونوں ساتھ ساتھ، بے چین تھے پارے کی مانند، ساکت تھے خشک جمیل کی تہ میں لگے برائے نام پانی کی طرح۔ لیکن یہ دونوں باتیں باوردی مژدب ڈرائیور گل باز کی سمجھ سے باہر تھیں اس کا خالی سا ذہن شاید پہلی مرتبہ سر کی دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا۔ اس گل باز کو یہ تو تازہ چل گیا تھا کہ اس کے پاس بھی دماغ ہے مگر اس سے اسے اپنے صاحب کے دماغ پر چٹک ہو رہا تھا۔ تنگ سے بازار میں جا بجا پھیلے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر سے ماڈل کی سیاہ چمکتی گاڑی چلا نا اسے کوٹ کا باعث لگ رہا تھا، مگر ڈاکٹر حماد احمد ابھی تک اپنی اسی حالت میں تھے جس محتاجی نظروں سے اپنے دائیں طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے گاڑی دھیرے دھیرے چلانے کا کہہ کر نظریں دائیں طرف مرکوز کر لیں۔ وہ متحیر تھا ہر پٹیاں تھا۔ اٹھارہ سالہ اس ملازمت میں پہلی بار وہ ایسے گندے اور مصروف بازار میں گاڑی چلا رہا تھا۔ گدھا گاڑیوں، تاجگوں، سائیکوں سے بچ بچا کے ٹکنا بہت مشکل کام تھا اس کو ڈاکٹر حماد احمد سے زیادہ گاڑی کی نگہ تھی۔ کچھ دور چل کر اسے سڑک پر گزرتا ایلنے کی وجہ سے گندا پانی نظر آیا تو اس نے بولکرا کیچے کی طرف گردن گھمائی اور ہلا چکا۔

”صاحب! آگے گندے پانی سڑک پر کھڑا ہے۔“

”گاڑی دھیرے دھیرے چلاتے رہو۔“ انہوں نے سرسری انداز میں کہا۔ اس

”حماد احمد! زمانوں کی جھل جھل نے کئی کی ترم بھی جھین لیا ہے، اندر دروازے کے پیچھے کیا بچا ہوگا؟ مہرو، پھوپھی یا ان میں سے ایک۔“ اسی لئے چرچاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا، ہلکی سی جھری سے دیکھا گیا اور پھر پورا دروازہ کھول کے مہرو نے انہیں خوش آمدید کہا۔

”حماد تم!“ وہ سفید دوپٹے میں لپیٹی مہرو ہی تھی جو دروازہ بند کر کے ان سے پوچھ رہی تھی، وہ خاموش لگا ہوں سے بدلی بدلی سی مہرو کو دیکھ رہے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ اکثر حماد احمد!“

”شکر ہے تم نے پہچان لیا، ورنہ مجھے تو تمہاری گلی تلاش کرنے میں بھی بہت وقت لگا۔“ وہ چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”اس گلی کو تم سے تارسانی کا شہو ہوگا، شاید اس لیے۔“ ہمیشہ کی طرح اس کی لکھ دار آواز کو گنتی جو حماد احمد کو چونکا گئی۔ آواز کی لکھ سے وہ آج بھی کچیں چھپیں سالہ مہرو تھی۔ اس کی بڑی بڑی ستارہ جیسی آنکھوں کے بعد سب سے نمایاں خوبی اس کی آواز میں تھی، صاف سیدھا سا جو بھی بولتی وہ سننے والوں کو بہت اچھا لگتا۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے بعد وہ ہوسل سے اکثر شام کو اس کی باتیں سننے کے لیے چلے آتے تھے۔ تب تو پھوپھی جی بھی حیات تھے، بیمار رہتے تھے مگر شپ کرنے کے باہر تھے، وہ محلے کے بچوں کو نیوٹن پڑھاتے پڑھاتے ان کی طرف دیکھتی اور کہتی۔

”آج میں چائے بنا کر دیے والی نہیں، کیا روز روز تم اٹھا کر آ جاتے ہو۔“ اس جیلے میں زندگی بھر چائے پلانے کا اقرار چھپا ہوتا مگر وہ ایک مرتبہ بھی اس کو یہ احساس نہ دے سکے۔ فحش جو کر انہماک سے جھوم جھوم کے پڑھتے ہوئے بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر دیر سے کہتے۔

”ایک دن آئے گا جب تم چائے پلانا چاہو گی اور تم نہیں آئیں گے۔“

”صاف کہو، جب ڈاکٹر بن جاؤ گے تب۔“ وہ مسکرا کر کہتی۔

وقت نے یہ بات بھی سچ ثابت کر دی تھی۔ وہ ہر روز جب چائے بنانے لگتی تو اسے حماد احمد کی یاد آتی، تڑپاتی۔ پہلے اب اسے دکھ بانت لیتی تھی لیکن پانچ سال سے تو تمہاری تھی۔ ابا دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ صرف یادوں کے سہارے رہ گئی۔ اتفاق کیسے کہ اس وقت بھی

دشاہ کی نماز پڑھ کے چولے پر چائے رکھ کے وہ انہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ آگئے۔ ”مہرو! محبت تو تم سے بھی کرنے کو تیار تھا پر۔“

”پر تم میرے لیے بے کار تھیں۔“ اس نے جلد جھین لیا تو وہ صاف گوئی سے بولے۔ ”ہونہ! شاید اب بے کار نہ بھی کہوں تو سود مند بھی نہیں تھیں۔“

”ہاں! ابا کی عمر بھی کمانی کی شکل میں یہ پرانا ایک کرے اور چورٹے سے دالان والا گھر بچ کر بھی تمہارے شان دار مستقبل کی ایک اینٹ رکھنے کی استطاعت نہیں تھی۔“ مہرو نے اچلتے پانی پانی میں پی ڈالتے ہوئے اعتراف کیا۔

”جب کہ مجھے شان دار مستقبل کے لیے مضبوط بنیاد کی ضرورت تھی۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے کمرہ لہجے کوئی بار سہارا دینے کی کوشش کی، پر مہرو دس دی اس کمزوری کا راز کھل رہا تھا۔ ان کی ٹیک سے پیچھے چھپا گئی آنکھوں میں سیلوں دور کی کرب ناک تمہائی تھی۔

”چلو! مل گئی تھی نا مضبوط بنیاد! اب کیا کھڑا ہے جو ستانے چلے آئے۔“ اس نے کچی مٹی کے دیسی بڑے بڑے گولوں میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نہ نہ مہرو! زہر نہیں، امرت! تمہارے وجود سے چٹکی امرت پر میرا آج بھی حق ہے۔“ انہیں مہرو کا جملہ کچھ تلخ محسوس ہوا تھا اس لیے جلدی سے بولے۔

”دیکھ زہر لکڑی سے صرف گھن گرتا ہے اور اس عمر میں ڈاکٹر حماد احمد گھن تم پر گرے یہ مناسب بات نہیں۔“ مٹھی چائے کے باوجود لہجے میں کڑواہٹ کہاں سے آگئی

اس پر خود مہرو کو حیرت ہوئی۔

”مہرو! میرے سینے پر بوجھ ہے، گناہ کا بوجھ جو اب پوری شدت سے دردے رہا ہے، میرے اعصاب مات کھا گئے ہیں اس گناہ کی تلانی بھی میرے اختیار میں نہیں۔“

گرم گگ کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ بڑی سادگی سے چائے کی چسکی لینے ہوئے بولی۔

”ہر گناہ کی تلانی ممکن ہے، بس طریقہ مختلف ہو سکتا ہے۔“

”نہیں، نہیں! ہر گناہ کی تلانی ممکن نہیں۔ کیا تمہارے گناہ کی تلانی ہوئی؟“

”میرا گناہ تو میری منگلی تھی، اس میں تلانی کا راستہ ہی کہاں ہوتا ہے؟“

”میرا گناہ میری امیری ہے اس میں تو تلانی کا وجود بھی نہیں ہے۔ میرے ساتھ،

میرے سامنے اذیت ناک گناہ ہے۔

”خدا! جانے دو یہ مصروفی گناہ آئینہ انداز! میں مرعوب نہیں ہونے والی۔“ مہرو نے جس کر کہا تو وہ کرائے۔

”مہرو! تم نہیں جانتیں، میں کتنا بڑا بچہ تم سے بول رہا ہوں جو میری جھینس ستائیں سالہ زندگی پر محیط ہے۔“

”خدا! امت یلودوہ بچ جو تمہارے ساتھ مجھے بھی دیکھی کر دے۔“

”تو تم میرا بوجھ نہیں بانٹو؟“ پُرا امید لگا ہوں میں مہرو سے منت ہی منت تھی۔

”اچھا پھر بتا دو کہہ ڈالو بس ایک منٹ بھی ضائع نہ کرو۔“ اس نے ایک دم ہی سارا اعتماد ان کی جھولی میں ڈال دیا۔

”لیکن اس کے بعد تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔“

”نفرت کے لیے کیا دیر سارے ماہ و سال کافی تھے؟“ سوالیہ لگا ہیں سر پاپا احتجاج

بن گئیں۔

خدا داد! حجاب ہو گئے، کچھ مطمئن ہو گئے جوتوں کے تسمے کھول کے اپنے اطمینان کا پہلا ثبوت دیا۔ اس کے بستر پر دراز ہونے کے انداز میں بیٹھے وہ چلے کے پاس سے اٹھ کر ان کے سامنے قہر غم سنائی آکھونی کرسی پر آ بیٹھی۔

”تم نے مجھے پھوپھائی کی دوقات کی خبر تک نہیں دی۔“ زرد بلب کی روشنی میں دیوار پر لگی پھوپھائی کی تصور دیکھ کر انہیں یاد آیا۔

”کسی غریب کا دنیا سے اٹھ جانا اتنا اہم بھی نہیں کہ اس کی اطلاع دینی ضروری ہو، اس غریبوں کے محلے نے تو مجھے بھی پتا نہیں چلے دیا۔ تجبیز دہشیں کے سب مراحل طے ہو گئے۔“ مہرو نے لہجے کی کھٹک کو کھنکھرتے نہیں دیا مگر اس کی آنکھوں کے پھیلنے کو شے خدا احمد سے چھپے نہ رہ سکے۔

”تم کیا کرتی ہو اب؟“

”خدا! خدا! تم اپنے بارے میں بات کرو، مجھے کیا کرنا ہے بس ٹیوشن ہی چل رہی ہے غریب محلے داروں کے گھر چھوٹے ضرور ہوتے ہیں پر ان کی ہانڈیوں کے منہ بڑے ہوتے ہیں۔ وہ گھر کی خیر و برکت کے لیے روز بکھ نہ کچھ نکالتے ہیں، میں ان کا دل نہیں توڑتی۔“ مہرو

نے دیر سے کہا۔

”مہرو! تم نے اپنی زندگی پر برف کی سل رکھی ہی کیوں؟“

”چھوڑو کیا ذکر ہے بیٹھے، یہ بال بول چوپ میں سفید نہیں ہوئے، زمانوں نے اپنے قدموں کے نشان چھوڑے ہیں۔“

”مجھے احساس ہے، اس کی وجہ کچھ نہ کچھ میں بھی ہوں۔“ وہ شرمندگی سے بولے۔

”پلو! تمہیں کچھ نہ کچھ کا اندازہ ہوا، میرے لیے اتنا بھی کافی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”مہرو! مجھے ناگہمی کی ہی تو سزا ملی ہے میں بھوکا دھنسی انسان تھا، ڈاکٹر کے گاؤں

میں چھینے سے ملیسی کے بھولے کی اوقات نہ بدلی، نام کا بھولا پاؤں جاب مکمل کر کے کرے

میں کھسارات دن بیس ہال سے بستر کے سامنے والی دیوار پر مرضی لگا تا رہا تھا، مہرو! ڈوب

کے سرکاری چھوٹے سے ہسپتال میں میری ڈیوٹی تھی جی اور میں غم دھن سے سلگ اٹھا تھا۔ میں

نے جو اننگ تو قبول کی مگر کس حوصلے سے یہ تو تم جانتی ہو۔“ انہوں نے رک کر اس سے تائید

چاہی تو مہرو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

پھر وہ کچھ دیر کسی سوچ میں ڈوب رہے، مہرو انہیں غور سے تنک رہی تھی۔ ان کے

چہرے پر وقت نے اچھی خاصی لکیریں بھردی تھیں، کپٹینوں پر سرخی بادلوں کا بھرا تھا اسے غور

سے دیکھتا پا کر وہ چو گئے۔

”کیا دیکھ رہی ہو مہرو؟“

”تمہارے چہرے سے گزرے ماہ و سال کا شکر کر رہی تھی۔“

”بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں، میں مصروفیت میں ماہ و سال شمار نہ کر سکا۔“

حریص اور بے مبر انسان تھا رات دن کامیابی اور ترقی کی منزل شارت کٹ میں حاصل کرنے

کی فکر تھی۔ جنہیں، پھوپھائی کو کہیں رکھ کے بھول گیا اسی شہر میں، بچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی تمہاری

یاد بھی نہیں آئی۔ شاید وقت میرے ساتھ چلنے لگا تھا۔ میرے سینئر احسان الہی نے اپنے

ہسپتال میں ایک کمرہ کیا دیا کہ میں زمین سے حسب فضا اٹھا چلا گیا، لیکن پھر بھی ابھی وہ

ٹارگٹ پورا نہیں ہوا تھا، میں بے چین تھا کبھی کبھی مضمحل سارات کے ستانے میں دیر تک بیدل

سزکس نہ پتا مگر قرار نہ ملا، اس طرح بہت سادقت گزرا گیا۔ ایک روز ڈاکٹر احسان الہی نے

مہانپ کر میری دکھتی رنگ پہ ہاتھ رکھ دیا یہ کہہ کر کہ۔

”نوجوان! کسی شام تقدیر کا ستارہ تمہارے باپ پر ضرور چمکے گا۔ تم اپنی فیملی کے ماہر گانا کا لوجسٹ سمجھے جا رہے ہو، لوگ تمہیں جاننے لگے ہیں کیوں مگر مندر رہتے ہو؟“

”مہرو! یہ فکر نہیں ہو بلکہ حرص ہوتی ہے جو چھوٹے شہروں کے دیہات، قصبوں کے رہنے والوں میں جڑیں پکڑ لیتی ہے، بڑے شہروں میں سورج کی جگہ یہ اپنا دیدہ دکھانے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں بالکل اس کوڑھ کرلی کی طرح جو ہستروں کو عادتاً جیسے ڈالنے پر مجبور ہوتی ہے۔ میں بھی ذات کی کوڑھ کرلی ہی تو تھا مجھے ہستیرے سے، بڑے ہستیرے سے جیسے کے جنوں نے ایسے قدموں پر گریا کہ میں ملی ہی نہ سکا۔ شہر کے پوش علاقے میں عالی شان کوشی میں رہنے کا خواب، معروف علاقے میں شان دار ذاتی ہسپتال بنانے کی آرزو پوری ہوگئی، کوڑھ کرلی نے اپنی اوقات پر پھر وہ ”دیا“ دے سانس لینے کو رکھے۔

”کتنی عجیب سی باتیں کرنے لگے ہو، بڑھے ہو کر سنا ہے ہو گئے ہو۔“ مہرو نے حسب معمول سادگی سے کہا۔ وہ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ موہاں کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، وہ چند لمحوں کی بات کے بعد فوراً آٹھ کمرے ہوئے، بات نامکمل رہ گئی۔

”مہرو! سیریس پیٹنٹ سے فوری آپریشن کرنا ہے میں جاتا ہوں، لیکن پھر آؤں گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے جلدی سے جوتے پہنے، تھے باندھے۔

”شکر ہے کہ تم اپنے پیسے سے بہت تخلص ہو۔“ مہرو نے بھی کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔

”نہ، نہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے، بہت مال دار میرے ہے۔“ انہوں نے فس کر اپنا مذاق سا اڑایا اور آنکھوں آنکھوں میں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ مہرو دروازہ بند کر کے کچھ دیر دروازے کی پشت سے ٹپک لگائے حماد احمد کے احساس کو محسوس کرتی رہی اور پھر صبر کی طویل سانس بھر کے کرسی پر گر گئی۔ یادوں کی جھلکی چلنے لگی اتنا شور برپا ہوا کہ سانس کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، خشک کلوی جیسے ہاتھوں سے دل تھا، اور اٹھ کر پانی کا گلاس بھر کے غناخت پیئے سے قرار آیا۔ سینے میں چلتی ہوئی کچھ کم ہوئی تو کرب ناک مسکراہٹ کیوں پر نکھیل گئی۔

”واہ! مہرو جہانگیر! تجھے یاد کیوں نہ رہا کہ قبر پرانی ہو یا نئی، اس کی لپائی پوتائی نہ کرنی پڑتی ہے ورنہ مٹی کو ڈھسے جانے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے؟ آج تو قبر ڈھسے جاتی ہو“

ذرا سی کی رہ گئی۔“

پھر کی مٹنے لگے اسے خود کو سیٹھنے میں، سیٹھنے کو کی اور تھا بھی تو نہیں، کتنا کٹھن تھا اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کی حرمت کرنا! ایسا کرتے ہوئے سوکے خشک مریل ہاتھ کھانک ہوتے ہیں اور روح بین کرتی ہے مگر اس کے کھانک ہاتھوں پر سرم رکھنے والا تھا ہی کون؟ خود ہی سہارا دیا خود کو اور کھڑی ہوگئی۔ زندگی کی وہی مختصری مصروفیات شروع ہو گئیں لیکن دل ہر ملی، ہر گھڑی اس کا خطر رہتا جس کے آنے کی قوی امید نہیں تھی، جانتی تھی کہ وہ شہر کا معروف گانا کا لوجسٹ ہے اس کے پاس وقت اور فرصت کہاں؟ وہ تو اتنے سالوں بعد شاید خواب میں چل کر آ گیا تھا، اس کے ہر مسئلے کا حل اس کے تعلقات اور چمک جبک میں موجود ہے، اس مگر میں اس کے کسی مسئلے کا حل کہاں؟ اور نئی وہ اتنی باحیثیت تھی اس کی زندگی میں کہ وہ اسے اپنا قصہ گمانہ سنائے آ گیا۔

”ہونہ! ابھی بے وقوف بنانے میں ماہر ہوں۔“ اس نے گویا اس سے بات کی اور اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگی۔

مگر یہ سچ تھا، وہ تیز بارش میں چھتری تانے آگئے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے تو روایت بدل ڈالی۔“

”اس پر فحشو، تجھے لگاؤ۔“ انہوں نے چھتری کا لیور دبا کر اسے سمیٹ کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے تو جوتے تر تر ہیں بلکہ کچڑ میں بھرے ہیں۔“ ان کے سیاہ چمبی جوتوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے دھیانی میں کہہ گئے۔

”تو آگے بڑھ کے اتار دو اور صاف کر دو۔“ وہ زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسنے ہنسنے آنکھوں میں پانی مسکرایا تو بولی۔

”حماد احمد! جوتے اتارنے کے لیے حیثیت کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ دیکھو! جوتے بڑی اتارے یا ملازمدار بس! میری ان میں سے کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

”سوری! آتم سوری۔“ وہ کھینچنے سے ہو کر جب سے رومال نکال کر خود ہی جوتے صاف کرنے لگے۔

”چائے تو پیو گے نا۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں ان کی شرمندگی نظر انداز کر گئی۔

”ہند، ہاں! بہت سردی ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر چو لھے کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ وہ پہلے سے چولہا جلا کر دودھ ابال رہی تھی جو نمی دودھ کی دہنجی میں ابال آیا تو اس نے کپڑے سے کپڑے دہنجی اتاری اور چائے بنانے والی چھوٹی سی دہنجی چولھے پر رکھ دی، وہ چولھے میں جلتی آگ کو دیکھ رہے تھے۔

”تمہیں یہاں آتے ہوئے بہت عجیب سا لگتا ہوگا۔“

”مہرو! ڈاکٹر حماد امیر کے لیے تو یہاں آنا ممکن نہیں، مگر بھولے کے لیے ممکن ہے۔“

”گمنامہ گانا کالو جسٹ ڈاکٹر حماد امیر نے کیا ہے بھولے کے نہیں؟“ چائے بنانے

کے عمل میں مصروف رہتے ہوئے اس نے مکمل کا سیاہ کپڑا پہن لیا۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ چو لھے۔

”اور ہال سے نیچے فریج سے ہیں۔“ وہ ایک سرٹال گئی۔ ”میں نے یہی بیٹی کو انگلیشن

سینٹل کرا دیا ہے، خود بھی سال دو سال تک وائٹنڈ اپ کر کے چلا جاؤں گا۔“ انہوں نے

دھیرے سے بتایا تو وہ چو لگی۔

”کیا! کب؟“

”یہاں سے جانے کے بعد یہی بہتر فیصلہ لگا جو میرے لیے اور ایمان کے لیے

بہتر تھا۔“

”اور تمہاری بیوی؟“

”وہ تو بے ضروری عورت ہے، ایمان نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔“ وہ بولے۔

”خیر تمہاری باتیں تم ہی جاؤ، لو چائے پیو۔“ اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

”انہیں یہاں سے بھیجے کے باوجود میں کانٹوں پر چل رہا ہوں، انگاروں میں گھرا

ہوں، کچھ پھینکنے کے لیے انہیں بھیجا مگر میرے گناہ کا جو سر شروع ہو چکا ہے وہ فرار سے ختم نہیں ہو

گا۔۔۔۔۔ مجھے اب خود سے چھینے کی جگہ نہیں مل رہی، نہ گھر میں، نہ ہسپتال میں، بہت بے گل ہوں۔“

”تو کیا سمجھتے ہو کہ اس بے گلی کی وجہ تمہاری بیوی اور بیٹی تھی یا پھر تمہیں انگلیشن جا کر

قرار مل جائے گا، میرا خیال ہے حماد امیر! گناہ کا خاتمہ اعتراف گناہ سے ہی ہوتا ہے۔“

ان کی طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے مہرو نے ان کے دل پر چنگی بھری تو وہ

تسلا اٹھے۔

”یہی تو کرنا چاہتا ہوں، صرف تمہارے سامنے باقی جگہ نہیں ہے، کوئی ایسا نہیں

کہ میں ان کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔“

”میرے سامنے کیوں؟ میرے ساتھ آخر کتنی دور چلے ہو تم۔ کیا راہ درسم ہے،

جانے کتنی رتوں پہلے تم اپنا اور میرا رشتہ کہیں رکھ کے بھول گئے مجھے کیا معلوم تم نے کیا، کیا اور کیا

نہیں۔ کوئی نہیں ہے تو بند کرے میں خود سے کہہ ڈالو۔“ وہ خاصی سنجیدگی پر اتار آئی۔

”طعنے نہ دو مہرو! تم نے شاید اب تک میرا ہسپتال نہ دیکھا ہو لیکن ڈکرتو سنا ہوگا۔

میں گائے کے شےبے کا جن سمجھا جاتا ہوں، میرے ہاتھ میں اللہ نے شفا اور دولت دونوں ایک

ساتھ ہی رکھی ہیں۔ شاید یہی کبھی کوئی شادی شدہ بے اولاد جوڑا مانوس گیا ہو یا شاید یہ کسی نسوانی

مرض کا میں علاج نہ کر سکا ہوں۔ مگر مہرو! یہ تو اب کی باتیں ہیں، بات تو وہاں سے شروع

کرنے کی ہے جب میرے پاس اتنا کچھ نہیں تھا شفا تو تھی پر نام اور دولت اتنی نہیں تھی۔۔۔۔۔ تب

مجھے شارٹ کٹ کی تلاش تھی۔“ وہ چو لھے کے پاس سے اٹھے ڈراڈور پڑی دوسری کرسی پر آرام

سے بیٹھ گئے۔ مہرو بھی چائے کے برتن سمیٹ کر چار پائی پر آ بیٹھی مین اس وقت دروازے پر

دسک ہوئی، حماد امیر رک گئے، مہرو نے بیروں میں چپل ڈالی اور دروازے کی طرف گئی، حماد

امیر نے کرسی کی پشت سے سر نکال کے انھیں سمونہ رکھی تھیں جو نمی دہ کچھ دیر بعد وہاں آئی تو

انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”کون تھا؟“

”مساے سے کوئی آیا تھا، کھانا دینے۔“ مہرو نے بتایا۔

”تم کھانا نہیں پکاتیں کیا؟“ ایک دم ہی انہیں جیسے خیال آیا چو لھے کے چاروں

اطراف نگاہ دوڑائی، کھانا پکانے کا کچھ خاص سامان نہیں تھا۔ صرف چھوٹا موٹا سامان ہی نظر

آ رہا تھا۔

”بتایا تو تھا کہ محلے والوں کی ہانڈی کے منہ کھلے ہیں وہ خلوص سے بھیجتے ہیں، میں

ان کا مان رکھ لیتی ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”بس بہت رکھ لیا مان! تم یہاں سے چلو، میری کوئی خالی ہے تم وہاں رہو۔“

وہ ایک دم جذبہ باتی ہو گئے۔

”حماد احمد! تمہاری بات سننے کی اتنی قیمت نہیں لے سکتی میں، اپنی بات مکمل کرو، میرے مسائل پر توجہ مت دو۔“ اس نے اس طرح بات کی کہ حماد کو شرمندگی ہی محسوس ہوئی۔

”میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔“

”تو تباہ کیا تار ہے تھے تم؟“ وہ ایک دم ان جان بگنی گو حماد احمد کو پھر سے اپنے خیالات بکھا کرنے کے لیے محنت کرنی پڑی، اس دوران وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ جب کہ ہونٹ کاٹنے ہوئے انگلیاں جٹاتے ہوئے انہیں کافی دیر ہوگئی، شاید وہ ہمت سمیٹ رہے تھے یا پھر سب کچھ ان کے ذہن میں منتشر تھا پھر ایک دم ہی وہ بولے۔

”مہرودا! میں خود غرض اور حریص ضرور تھا مگر کمزور نہیں تھا۔ جانے اس کے سامنے کیسے کمزور پڑ گیا۔ لالچ و حرص نے آن واحد میں مجھے گندا کر دیا، میں چاروں خانے چت اس کے بلیک چیک پر گر گیا۔ وہ اچانک آئی اور صرف چوتھی ملاقات میں مجھے اس مقام پر پہنچ کر گئی جہاں آج کھڑا میں ملامت کر رہا ہوں، ٹوٹ رہا ہوں، اپنی اوقات پر غور کر رہا ہوں، مہرودا میری بے بسی تو یہ ہے کہ میں تمہارے سوا کسی سے اپنا قصہ گناہ شہر نہیں کر سکتا۔“ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگے تب مہرودا کو وہ بہت معصوم اور مظلوم دکھائی دیے۔

”حماد! نہ بچی کر دو خود پر، جہاں اتنے عرصے سب گناہ ٹوٹ دیا رکھے تھے اب بھی انہیں دبا رہے دو، مت ظلم کرو میں تمہیں اس روپ میں نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے اپنائیت سے کہا تو وہ شکست خوردہ سے مسکرا دیے۔

”جمہوری تو ہیں ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں اس سے محبت ہوگئی تھی اور تم نے..... اپنی بیوی سے؟“

”نہ نہ بالکل غلط.....“ انہوں نے اس کی بات جیسے گامنی ڈال کے کاٹ دی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر بادلوں کی شدید گڑ گڑا ہٹ نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”بادل گرج رہے ہیں، لگتا ہے بارش ہونے کو ہے۔“ مہرودا نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر چلے گئے پاس گئی اور وہاں سے ایک بائی اٹھا کے کمرے کے دامن ہاتھ والے کونے میں رکھ دی۔ وہ حیرت سے دیکھ رہے تھے تب وہ انہیں حیرت سے نکال لائی۔

”چھت سے پانی ٹپک ٹپک کے پھینکے موسم کا مزہ دو گا۔“ وہ سادگی سے فہم کر بولی اور پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔

”چھت چھتی ہے، یہ تو بہت برا ہے اور تم اتنے اطمینان سے بتا رہی ہو۔“ وہ خامسے فکر مند ہو گئے۔

”تو کیا کروں؟“ وہ فہمی۔

”مہرودا! یہ سننے کی بات نہیں ہے، چھت کمزور اور خستہ ہے تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہئے۔“ وہ تنبیہ کی سے بولے۔

”فکر نہ کرو، تم پر نہ پانی گرے گا اور نہ چھت!“ اس نے اور زیادہ پر مزاح انداز میں کہا۔

”میں اپنی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔“

”حماد احمد! تم اس کے بارے میں بتا رہے تھے، بتاؤ۔“ وہ بات ٹال کر بولی مگر رترو پانی چھت سے بائلی میں گرنے سے وہ بے چل ہو گئے، کچھ دیر بائلی میں گرتے پانی کو دیکھتے رہے اور کچھ دیر چھت کے اس حصے کو گھورتے رہے جہاں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

”نہیں! میں اس شور میں نہیں بتا سکتا۔“ یہ شور میرے اندر کے شور سے زیادہ ہے، میں چلتا ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ اس نے ایک لفظ نہ کہا، ان کی پشت پر کھڑی ہوگئی، دروازہ کھولنے سے پہلے وہ چلے اور بولے۔

”مہرودا! تمہارے پاس آ کر تو میں ایک اور گناہ میں ملوث ہو گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے، تیز بارش نے گلی میں اچھا خاصا کچھڑ زود پانی کھڑا کر دیا تھا جس میں شرواپ شرواپ چلنے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔

”مہرودا! شاید میں تمہیں اپنا جرم نہ بتا سکوں۔“ ڈرائیور نے ان کے لیے گاڑی کا پھیلا دروازہ کھولا وہ مضطرب سے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے نکا کر خود کو تانا شروع کر دیا۔

”حماد احمد! تم بھلا کیسے مہرودا یہ بتا سکتے ہو کہ تم نے شارٹ کٹ کی تلاش میں کتنا ڈراؤنا فیصلہ کیا تھا۔ مہرودا کو کیا پتا وہ سزا حاکم جو بدری کون تھی؟ وہ جانتی ہے کہ میری محبوبہ ہوگی۔ ۲

ہا! احتمالاً بات! وہ تو خالی چیک بیک تھی جو ہر قیمت پر اولاد چاہتی تھی، جانے کس نے اسے میرا پتا دے دیا کہ وہ اپنے سر پہ چھلنی چھلنی مجھ تک آگئی، روداد کے منت کرتے لگی۔ اللہ نبی کے واسطے دینے لگی، میرے لیے یہ کوئی پہلی مرینہ تو نہیں تھی، چادر میں لپیٹا گدرے گدرے جسم والی

عورت کو میں نے علاج شروع کرتے ہوئے بہت سی تسلیاں بھی دیں۔ وہ خوف زدہ تھی برنی کی مانند، اس کا کل جیسا گھر ٹھکانے سے جتنا تھا کہ وہ بار بار گھر بچانے کی بات کرتی، مجھے کوئی حیرت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا وہ ایک روائی جاگیردار کی بیوی ہے، ایسی بیوی جو ہر طرح سے خود تو مکمل تھی مگر پھر بھی سزا بھگت رہی تھی جب میں نے اسے اس کے مکمل ہونے کی رپورٹ دی تھی تو وہ روتے روتے خوشی سے کل اٹھی تھی، پراگے ہی لمبے مرد بھگتیاں کیوں کہ چہ بدری حاکم الدین کو معائنے اور میٹ کے لیے لانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ ماپوس سی اٹھ کر چلی گئی۔ پھر پورے دو مہینے نہیں آئی لیکن جس روز وہ آئی تو ایک مہرے ہوئے علائم خیز سمندر کی مانند تھی جس نے چادر پھیلا کر دور دراز اپنے فیصلے کی گہرائیوں کا احساس دلانے کی پوری کوشش کی لیکن.....

”صاحب!“ وہ اور ابھی بہت کچھ سوچنے مگڑ دانیور نے کیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد پچھلا دروازہ کھول کے انہیں پکارا تو وہ چونکے اور لمبی سانس بھر کے باہر نکل آئے۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا بے چین سے کمرے میں داخل ہوئے، وفا دار ملازم نے کھانے کا پوچھا تو انکار کر دیا، دوسرے نے نیگم صلبہ کے فون کی اطلاع دی تو وہ ہوا میں اڑا دی۔ ذہن بھٹکا ہوا تھا ترستے بیڈ سے پاؤں الٹا کے بارش کے شور میں سوچتے، مسلسل بارش جاری تھی۔ اپنے کمرے کی چھت پر نظر پڑی تو انہیں ایک مرد مہرہ کے کمرے کی چھتی چھت یاد آگئی، اداسی اور دکھ سا مضطرب کر گیا۔ اٹھ کر بیٹھے گئے، مہرہ سے اپنی بے اعتنائی کا احساس ستانے لگا۔ احساس کی شدت کا کمال تھا کہ وہ رات بھر سوئے کتے بے حس اور شفاک تھے وہ کہ آسائش زدہ زندگی میں بھول کے بھی مہرہ انہیں یاد نہ آئی.....

ہجر کی ہفتے گزر گئے وہ مہرہ کے پاس نہ جاسکے ہسپتال کی مصروفیت نے موقع ہی نہ دیا۔ ایک بار پھر وہ جیسے مہرہ سے غافل ہو گئے۔

دراصل یہاں سے سب کچھ سمیٹ کر انہیں بیوی اور بیٹی کے پاس جانا تھا۔ وہ جلد از جلد سب کام سمیٹنا چاہتے تھے مگر یہ اتنا آسان کام نہیں تھا اس کے لیے وہ رات دن جوتوڑ کر رہے تھے۔ جس روز کافی حد تک وہ کامیاب ہو گئے تو ایک بار مہرہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ مہرہ نے نہ شکوہ کیا اور نہ کسی شدید مسرت کا اظہار کیا۔ یہ دونوں باتیں انہیں محسوس ہوئیں..... وہ کچھ گئے کہ دی طور پر مہرہ کو ان سے بہت بے شکوے ہیں مگر اس نے چپ سا دھ

رکھی ہے میری بے اعتنائی نے اس کی زندگی محرومیوں سے بھری ہے، میں مہرہ کا مجرم ہوں۔
”مہرہ! مجھے یہاں سے جانا ہے، یہاں میرا کچھ باقی نہیں رہے گا..... لوگ بھول بھال جائیں گے کہ کوئی مشہور گانا کا لوجسٹ حماد بھی کبھی تھا۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے۔

”یہ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ مہرہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک کہا تم نے کہ آخر تمہیں کیوں بتا رہا ہوں، سنو! وقت کی گردش کیسے تبدیلیاں لاتا ہے یہ بتا رہا ہوں۔“

”میرے ہاں تو ایک مدت سے وقت گزر گیا میں تو گزیرے وقت کے سکوت میں قید ہوں۔“ وہ طنز یہ مسکرائی۔

”کاش! مجھے یہاں سے جانا نہ پڑتا۔“ انہوں نے سرد آہ کے ساتھ دھیرے سے کہا وہ چپ رہی۔

”پوچھو گی نہیں کیا؟ کہ میں کیوں جا رہا ہوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پوچھنے کا حق نہیں ہے، خود جانا چاہو تو بتا دو.....“ وہ بولی۔

”مہرہ! میری بیٹی ایمان کو ایک لڑکے سے شدید محبت ہو گئی ہے وہ اس کے سحر میں گرفتار ہے وہ لڑکا بھی ایمان کو اپنی تقدیر سمجھتا ہے مگر.....“

”مگر تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا، غریب ہے۔“ وہ جملہ اچک کر بولی۔

”میں محبت کا دشمن نہیں۔“

”اس وجہ سے سب کچھ چھوڑ کے جا رہے ہو۔“

”وہ لڑکا میری حرص اور اپنی ماں کی خطا ہے، وہ ایسی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے جسے گھر بچانے کے لیے مجھ جیسے گناہ کا لوجسٹ سے مدد کی منت کرنی پڑی..... اپنے جاگیردار شوہر کی اتنا پرستی کا مجرم رکھنے کے لیے وہ اس حد تک آگئی کہ میں اس کی تکمیل کا حصہ بن جاؤں..... کیوں کہ اس کا مکمل شوہر کسی علاج معالجے کی وجہ سے اپنی ہنگ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا گھر بچانے کے لیے اس کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں بچا تھا۔ وہ میرے قدموں پر جھک گئی..... اسے اولاد چاہیے تھی، جانے کتنی دیر وہ بھلا کر بنی بیٹی رہی۔ میرے وجود پر کچھ پر سناٹا چھایا اور ہاں میں مساکت بیٹھا رہا۔ مگر اس کا یہ جملہ.....“

”ڈاکٹر صاحب! میرا شوہر کبھی شیت نہیں کرائے گا وہ مجھے طلاق دے دے گا۔۔۔۔۔

آپ مجھے بچاؤ۔۔۔۔۔ میرا سچ کچھ لے لو۔“ اس نے چمک چمکی میری گود میں رکھ دی، بھاری زیورات کی پوٹی میرے سامنے کھول کے رکھ دی تو میرا حریص ذہن جاگا اور میں رات کے سنانے کو کچل کے اس کا مددگار بن گیا۔۔۔۔۔

اس کا مہر خفا گیا اور میرا خواب مکمل ہو گیا مجھے دولت اور شہرت کے نشے میں کبھی کچھ یاد نہیں آیا، مگر وہ ایمان کی انگلی پکڑ کے میرے سامنے آ کھڑے ہوا ہے، میرا سارا نشہ احساسِ ندامت کی قبر میں اتر گیا ہے۔ یہ گناہ، خطا ناقابلِ عافی ہے۔

مہرو! میں کیسے ایمان کو بتاؤں کہ یہ لڑکا کون ہے؟“ وہ ساکت نظروں سے گھورتی مہرہ سے پوچھ رہے تھے مگر وہ تو حیرت کے سمندر میں اتر گئی تھی ایسے جرم کی تو اسے توقع ہی نہیں تھی، وہ تو انہیں صرف اپنا گناہ گار ہی سمجھتی تھی۔

”مہرو! مہرو! میں بچم ہوں، خطا کار ہوں پر وہ خطا اس سزا میں قبول نہیں۔۔۔۔۔ یوں میں کیا کروں، یہاں سے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔“ مگر مہرو اب بھی خاموش رہی وہ شرمندہ سے بڑی دیر کچھ نہ کچھ کہتے رہے، اس سے پوچھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ خاموش رہی، اس سے پہلے وہ کبھی خاموش نہیں رہی تھی یہ حریت لیے وہ وہاں سے اٹھ آئے۔ سینے کا بوجھ ہلکا کر کے ذہن کا بوجھ لیے۔۔۔۔۔ مہرہ کی حیران کن خاموشی کے ساتھ ساتھ چلے ہوئے گھر پہنچے۔

اس کے بعد بار بار انہوں نے مہرہ کو یاد تو کیا لیکن اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔۔۔۔۔ جو کچھ اس کی آنکھوں میں دیکھ آئے تھے اس کے بعد جیسے حوصلہ ٹوٹ گیا تھا بجھے بجھے دل کے ساتھ سب معاملات ختم کر کے، اپنی سیٹ بک کرائے سے ایک دن پہلے بڑی سسک کش کے سنگین سرے سے گزر کے اس سے آخری بار ملنے اور اس سے کی ہوئی زیادتی کی عافی کے لیے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا، وہ اس کے رو رو رہے تھے۔ آج بھی وہ چپ کھٹی ہر سوال جواب سے بے نیاز! انہیں کافی شرمندگی کا سامنا تھا خود سے مزاحمت کرنی پڑ رہی تھی، کافی دیر خاموشی میں گزر گئی، پھر وہ بولے۔

”مہرو! تمہارے ساتھ کیے ہوئے گناہ کی عافی تو ممکن ہے کیا مجھے معاف کر سکو گی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔ مضبوط چمت تلتے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے

کہہ گئے، وہ تب بھی خاموش رہی۔۔۔۔۔

”بولو، جواب دو مہرو!“ وہ مہرہ ہو گئے، تب وہ انہی اور گھر کے دروازے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔۔ وہ بچے میں گرفتار ہو گئے مگر چند لمحوں بعد وہ واپس آ گئی، اس کے پیچھے ایک ادیبز عمر کھیلنے سے جسم کا آدھی بھی اندر آ گیا، اس کا دایاں ہاتھ مڑا ہوا تھا، منہ سے رال چمک رہی تھی، سر کے کچھڑی میلے بالوں کو وہ دوسرے ہاتھوں سے سنوارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔۔۔۔۔ وہ اسے دیکھنے کے بعد مہرہ کو دیکھنے لگے ان کی نگاہوں میں استغہام تھا۔ سوال تھا، تعجب تھا۔۔۔۔۔ وہ کبھی گئی ہوئے سے سکر کر بولی۔

”حماد احمد! میں ذات کی کوڑھ کرلی نہیں ہوں۔“ طویل خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کی خوب صورت آواز ہمیشہ کے لیے ان کے دماغ میں اتر گئی۔۔۔۔۔ وہ دھڑام سے اس ایب ٹارل انجینی انسان کے سامنے گر گئے۔



کچھ میں ان کی باتیں آتی تو محض پر وہ ان کا اثر لینا نہیں چاہتی تھی۔ ماسٹری سے اسے صرف اس کی بیماری کی وجہ سے ہمدردی تھی۔ ورنہ ہیڈ ماسٹر صدیق کی بے بسی پر جب ماسٹری آنسو بہاتی تو وہ کہی نہ تھی۔

”مرد ذات ہے جی، رات دن آپ کی خاطر نوکری کرتے ہیں آپ کی بیماری شکاری کی وجہ سے قصہ کر لیتے ہیں۔“ عیدہ جسے ہیڈ ماسٹر کی نسبت سے وہ ماسٹری کہتی تھی حیرت سے اس کا منہ دیکھتی اور دردی شدت کو بھول کے کہتی۔

”اللہ رکھی! تو عورت ہو کے مرد کی فطرت نہیں سمجھتی۔ اپنے میل سے بھری کلیروں والے ہاتھ دیکھ کر بھی تجھے خود سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ ترا کا کیا کرتا ہے۔ تو اس کی عیاشی کا جب بتی ہوئی ہے۔“

”توبہ تو یہ کہیں ماسٹری جی! وہ درد میں ہے، اللہ لوگ بھی ہے، رات دن عبادت کرتا ہے۔“ وہ نماز مان کر انوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے عیدہ کو ایسے بتاتی جیسے وہ ان پڑھ اور جاہل ہو، درد میں اور عبادت کے معنی نہ جانتی ہو۔ دوسری پاس تھی۔ اس کی سادگی پر کھول کے رہ جاتی۔

”ہونہ! تو پاگل ہے، میں پاگل نہیں، مجھے پتا ہے ہیڈ ماسٹر صدیق شہر جاتا ہے۔ تری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ عیدہ جگست خوردہ سی اس کے سامنے دو روزہ ٹانگیں پھیلانے کی کوشش کرتی۔

اللہ رکھی صرف یہی تین سال میں جان پائی تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی شادی کو گیارہ سال ہو گئے ہیں، بے اولاد ہیں۔ ماسٹری پانچ چھ سالوں سے جوڑوں کے درو میں مبتلا ہیں۔ سمجھو کہ بچوں سے چھپے بتاتے بتاتے ایک روز حاکم نے آکر بتایا تھا کہ ہیڈ ماسٹر کے گھر کا کام کرنے والی عورت کی ضرورت ہے۔ پانچ سو روپے ماہوار ملنے کی لاچ میں وہ

محبت تیار ہوگئی۔ حاکم کی تو خوشی ہی خوشی تھی۔ تب سے اب تک وہ صبح سویرے اباء اور حاکم کا ناشا بنا کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر جاتی، وہاں ان کا ناشا بناتی، ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول چلے جاتے تو گھر کی صفائی کرتی میلے کپڑے دھوتی، دوپہر کا کھانا پکاتی اور پھر اس کے لیے ماسٹری جو کھانا دیتی وہ دوپہر کے بھل میں چھپا کے گھر لے آتی۔ جو بھی حاکم کشف شاہ کی درگاہ سے آتا تو وہ خوش خوش اس کے سامنے رکھ دیتی۔ وہ اپنی نماز والی چوکی پر کسی سلطنت کے حکمران کی طرح بیٹھتا اس کا لایا ہوا کھانا کھاتا۔ کبھی کبھار جب وہ کھانا رکھتے ہوئے بھول

ہنیری

اس نے لائین کی چٹنی اٹھا کے اجاس کی تلی سے جلی جلائی تو ابانے کہا۔

”اوئے پتر! مغرب سے پہلے روشنی کر دیا کر۔۔۔۔۔ میں اپنے لیے اندھا ہوں روشنی کے لیے تو نہیں، میں اسے نہیں دیکھ سکا پر یہ تو کہاں جو گے مجھ جو گے کو دیکھ سکتی ہے۔“ وہ لبا کی سادگی پر ہولے سے مسکرائی اور ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموش مسکراہٹ بھی جیسے انہوں نے دیکھ لی تھی۔

”تو سوچتی ہوگی، حاکم نے حق مہر میں اپنا اندھا ہوا تجھے دیا ہے، باقی تو اندھ ہر اسی اندھ ہر ہے۔“ اباء کے چہرے پر پھیلا رنج بھگی کی زور و روشنی میں اور گہرا سا ہو گیا تھا۔

”ابا! میں تیرے لیے روشنی لاتی ہوں، جلدی جلدی کھا، مجھے ماسٹری کو بھی جا کر روشنی کھلائی ہے، دوا کی کھلائی ہے۔۔۔۔۔ وہ بچپار علم کی درد سے تڑپ رہی ہوگی۔“ وہ تیز تیز بولتی ہوئی باہر گئی اور کچھ دیر پہلے پکائی روٹی پر بھنی ہوئی دال ڈال کے لے آئی۔ انہوں نے انداز سے اسے روشنی کے نوالے سے خشک دال اٹھائی چاہی تو فوراً جان گئے کہ دال خشک اور بھر بھری ہے۔ بمشکل تمام ایک نوالہ اتارا اور چیکر اس کی طرف بلا حائی۔

”اللہ رکھی! دو گھنٹہ پانی ڈال دیا کر سارے دن میں دو نوالے ہی حلق سے گزرنے ہوتے ہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ حاکم کی فرمائش پر خشک دال بنائی، اباء کی مجبوری بھول گئی۔

”چا چا، وہ حاکم کو کبلی دال اچھی نہیں لگتی، وہ جاتے ہوئے کہہ کر گیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے نعمت سے آواز دیا کر بتایا تو وہ تقریباً بھلا اٹھے۔

”اوئے اللہ رکھی! تو ساری حیاتی خشک دال ہی پکاتی رہے گی اور پاں تیرے پیر کا چکر بھی کبھی نہیں گے گا۔ جا، جا کے ماسٹری کی دوا دارو کر، وہ بھی تیرے ورگی ہے۔“ اس کی

کے چوکی پر بیٹھ جاتی۔

”تیرے کپڑے پاک صاف ہیں؟“ وہ جھلا کر پوچھتا۔

”کیا تو نہیں جانتا؟“ وہ کھسیانی سی ہو کر پوچھتی تو وہ اس کا اصل مطلب سمجھ کر کچھ نرمی سے سمجھاتا۔

”اوائے پاگل! عبادت میں ذرا سی کمی رہ جائے تو عمروں کی محنت بیکار چلی جاتی ہے۔ میں میلوں کا سفر ایسے ہی تھوڑی کرتا ہوں، آخری سیزمیاں چڑھ رہا ہوں، بس حضرت کشف شاہ سرکار کی نظر کرم ہونے والی ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے مسیت (سجدہ) میں سپارہ پڑھنے جاتا تو مولوی صاحب کہتے تھے کہ حاکم میں کوئی خاص روح سمجھی ہوئی ہے۔“ وہ بڑے فخریہ انداز میں زور شور سے اسے بتاتا اور وہ گردن ہلا کر اسے یہ یقین دلانی کہ وہ جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ بس کبھی کبھی معصوم سی بکری کی طرح گردن ڈال کے کہہ دیتی۔

”حاکم! تری اس چوکی اور ابا کی چار پائی کے سچ ممبری جگہ ہے۔ تین درے ہو گئے نہ تو نے چوکی چھوڑی اور نہ میں نے جگہ بدلی۔ بول کیا کبھی تری عبادت میں، میں آئی.....؟“ وہ اس پر بھی برا مان جاتا۔

”ٹھننے دے رہی ہے یا جتا رہی ہے۔“

”تو یہ، اللہ معافی.....! تو میرے سر کا تاج ہے.....“ اس کی اس طرح کی بات سن کر ابا کی آواز آتی۔

”اوائے، اوائے خوف خدا کر حاکم، یہ عبادت کی پہلی سیزمیاں ہے، یہ تو پہلی ہے، ولیوں کا مہر لے آئی..... تجھے سیزمیاں چڑھاتے، چڑھاتے خود نہ رہ جائے۔“

ابا کی ایسی باتوں پر وہ خاصا غصے میں آتا لیکن اس کی منت ممبری چپ کی نظروں کا مطلب بھانپ کے تسبیح کے دانے گھمانے لگتا۔ اللہ رکھی اس کے اور ابا کے درمیان چلی کی طرح ہی تھی۔ اس کا ان دورشتوں کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ابا اس کی وجہ سے حاکم سے لاتے جھگڑتے ہیں۔ انہیں اس کا بہنہ ماسٹر کے گھر کام کرنا نہ لگتا تھا..... پر وہ مجبور ہو گئے تھے۔ حاکم شروع شروع میں تو بھینے پر غمرانی کا کام کرتا تھا مگر شادی سے کچھ پہلے ہی کام سے اس کی طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔ شادی کے سال بعد تو اس نے بالکل ہی کام کاج چھوڑ دیا۔ بس معرفت کے رستے پر چل پڑا..... زیادہ وقت دربار کشف شاہ پر گزارتا، کسی، کسی وقت

گھر آتا تو اپنی عبادت والی چوکی پر بیٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتا..... ایسے میں اللہ رکھی اس کی مضبوط ڈھال بن جاتی۔ ابا کی ہر کڑوی کسی بات دو اچھ کر نگل لیتی۔ حاکم اس کی وجہ سے ہر گھر سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ چولے چوکی سے لے کر ابا کی اور اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ صبح سے رات گئے تک اس کے پیروں کا پھیر کھوتا رہتا تھا۔

بہن ماسٹر صاحب کے گھر سے واپسی پر ضروری چیزیں لے کر گھر پہنچتی تھی۔ حکیم صاحب سے ابا کی دوای، ہانڈی کا سامان اور تنکو کی ہٹی سے لائینن کے لیے مٹی کا تیل لانا معمولات میں شامل تھا۔ جب سے خدایہ علیہ السلام کے گھر بجلی آئی تھی تب سے وہ جیسے جیسے جوڑ رہی تھی محض بجلی کا کنکشن لینے کے لیے۔ پورے گاؤں میں بجلی آ چکی تھی۔ کچے کچے کھنوں میں، گھروں میں ایک دو بلب جلتے دیکھ کر وہ طولی ہو جاتی۔ بجلی کے کنکشن سے متعلق معلومات حاصل کیں تو پانچ چھ ہزار کا خرچہ بتایا گیا، دل پر گھونسا سادہ کے مبرا کا ٹھونٹ بھر کے رو گئی۔ حاکم کو بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔

”میمری اللہ رکھی تو خود چودھویں کا چاند ہے، اس کے ہوتے بجلی کی کیا لوڑ.....؟“ وہ ادا سے ٹل کھا گئی مگر ابا کو اس کی یہ بات بھی اچھی نہ لگی۔ وہ تنگی سے بڑبڑائے۔

”بہنہ بڑھرام کہیں کا.....!“

”ابا! تو خود بتا ہمارے گھر میں بجلی کی کیا لوڑ..... تو دیکھ نہیں سکتا، اللہ رکھی گھر میں ہوتی نہیں اوز میں تو دربار پر گر کر، سر دی برداشت کرنے کی مشق کر رہا ہوں.....“ وہ ذرا اؤنجی آواز میں ابا سے مخاطب ہوا۔ دراصل ایک ہی درمیانے سائز کا کمر تھا جس میں ایک طرف دو صندوق ایک لوہے کا ڈرم رکھا تھا۔ اس سے زرا دور ابا کی چار پائی تھی ان کے دائیں ہاتھ اللہ رکھی کی چار پائی تھی۔ سامنے دائیں ہاتھ حاکم کی نماز والی چوکی رکھی تھی، وہ اتنی بڑی تھی کہ جب سوتا ہوتا تو اس پر ہی سوجاتا ویسے عام طور پر وہ دربار پر ہوتا تھا۔ بیٹے میں ایک آدمی رات گھر میں سوتا تھا اس کے بقول..... ”حضرت کشف شاہ سے جب جانے کا اشارہ ملتا ہے تو آ جاتا ہوں، ورنہ وہیں عبادت کرتا رہتا ہوں۔ پیرو مرشد کو تو ناراض نہیں کرتا۔“ اللہ رکھی کے لیے تو اس کا کہا گیا (نحوۃ باللہ)، اللہ، رسول کا فرمان تھا وہ جذب کے عالم میں کھوکھ رہ جاتی۔

”تو پیرو مرشد کو ناراضی رکھ، انا کہ دن کو بھی پیرو بن جائے گا۔ چھو، ریشمیں سب مجھ سے پوچھتی ہیں کہ حاکم کب پیرو بنے گا.....“ اس کے نزدیک پیرو کا بننا، کسی گھر، پل،

”تو روٹی کھا لے۔“

”بھری ہے مغرب کی اذان ہو گئی ہے، مجھے دربار پر ہی نماز پڑھنی ہے حضرت سرکار کا حکم ہے۔“ وہ یہ کہتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ اللہ رکھی دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔ پھر باٹنے اس کی خاطر چپ سادھ لی مگر اس چپ کے پیچھے جو منظر تھا وہ اللہ رکھی کے لیے کڑی آزمائش بننا چلا گیا۔ وہ اب کے اندر سے اپنے لیے بولتی تھی۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی، دوسرے کہہ دیتی تھی مگر اب اس کی خاموشی نے اس کی آواز اس کی آہ و فریاد کا راستہ بند کر دیا۔ وہ لاکھ بولتی، باتیں کرتی۔ ادھر ادھر کی باتیں مگر وہ بس ہوں، ہاں کر کے مختصر سا جواب دے دیتے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی سامنے رکھتی تو کھالیتے ورنہ بھوک نہ ہونے کا بیان بنا دیتے۔ جبکہ گھر میں اب روز ہی دو چار گھروں سے کھانا آتا۔ منٹائی، بھل آتے وہ ہاتھ ہی نہ لگاتے۔ بلکہ منہ موڑ کے لیٹ جاتے وہ بھی بدل ہی ہو کر سب اٹھا کے رکھ دیتی۔ اگر حاکم آ نکلتا تو ان دونوں کو ہی ناشکری کے طعنے دیتا۔

”اوتے تم ناشکری کرتے ہو، لوگ میرے ہاتھ پاؤں چوتے ہیں، سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، میرے ہاتھ سے ٹکر چلتا ہے۔“ یہ سن کر اللہ رکھی کو تو فخر سامحوس ہوتا مگر اب اس کے گلے سے ٹھکڑا پیدا ہوا تو اور ڈھیر سا رانیم وہ ملحق میں اچھال کر اس کا تسخراڑا تے۔ تو حاکم ان کی اس حرکت پر جھل جھل جاتا۔

”جی نہیں کرتا اس گھر میں آنے کو، میں آتا ہی چھوڑ دوں گا۔“

”اوتے بیہر حاکم! کا کا اس گھر بھرا تا دربار ہی بنالے ہم کھر کھر جاتے ہیں۔“ ابانے تھکی کو منٹاس میں ڈبو کر کہا۔ تو اللہ رکھی فوراً ان دونوں کے درمیان اسن کی فاختہ بن کر آجاتی۔ اور بات آتی گئی ہو جاتی۔

لیکن حاکم نے جو گھر نہ آنے کی بات کی وہ سچ کر دکھائی۔ ہفتوں وہ گھر کا رخ نہ کرتا۔ اللہ رکھی دل ہی دل میں اس کے لیے بے قرار بھی رہنے لگی اور ہو لے گئی تھی۔ مگر اس کا اظہار وہ اب کے سامنے کر نہیں سکتی تھی۔ ویسے ہی موسم کی تبدیلی سے اب اس کی صحت متاثر ہوئی تھی انہیں بخار رہنے لگا۔ کھانسی اور ریٹھ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دوسری طرف ہیڈ ماسٹر صاحب ریٹائر ہو کر کاروبار کرنے کی غرض سے شہر چلے گئے تھے مگر میں ماسٹری اکیلی تھی۔ جوڑوں کا دروازہ تنہائی اس کے پاس تھی۔ اللہ رکھی اس کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی تھی۔

وہ سب کام کاج کرتی، بالوں میں تیل لگاتی، کنگھی چوٹی کرتی۔ ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ اپنے حاکم کی باتیں خوش، خوش تاتی ایک دن پھر اسے جیسے خیال آ گیا جلدی سے بولی۔

”ماسٹری! میں حاکم سے تیل پڑھوا کے لاؤں گی۔ دیکھنا درد چنگی میں غائب ہو جائے گا۔“

”یہ درد سانس کے ساتھ جائے گا۔“ ماسٹری جواب میں افسردہ ہو گئی۔ مگر اس نے جو کہا وہی کیا۔ خالص سروس کا تیل خرید اور حاکم کا انتظار کرنے لگی۔ مگر اس بار حاکم نے پندرہ دن سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی گھر میں قدم نہ رکھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ با کے بخار میں مستقل بخیر اوتھا۔ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ حکیم سے دو اینٹ لالا کھک گئی تھی۔ ماسٹری کو اب اس کے بخار کے بارے میں بتایا تو اس نے فس کر کہا۔

”اپنے حاکم سے پانی پڑھوا کے کیوں نہیں پلاتی؟“ یہ بات اس کے دل میں کھب گئی۔

”حضرت کشف شاہ کی مہربانی ہے، یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ آج ہی آپ کے لیے تیل اور اب اس کے لیے پانی پڑھوائی ہوں۔“

”میرے لیے تو چھوڑ کیونکہ میں کل صبح اپنے بھائی کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی۔ بس تو میرے کپڑے اور ضروری سامان سیٹ کے رکھ دے۔“ ماسٹری نے ڈنڈیاں آکھوں سے کر کے دروازہ پر کھڑا کر دیا۔

”ہیں! آپ نے اچانک۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہیڈ ماسٹر صاحب! تو کب سے مجھے گھر بھیجنا چاہتے تھے۔“

”آپ شہر نہیں جائیں گی، وہاں تو بڑے اسپتال ہیں، علاج کرا لیتا۔“ اپنی دانست میں اس نے ماسٹری کو اطلاع فراہم کی۔ وہ ہولے سے مگرادی۔

”دہاں میری کوئی جگہ نہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی شہری بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔“ یہ ایسا انکشاف تھا کہ ٹپ آسو گرنے لگے۔ بڑی دیر تک وہ افسردہ سی سامان اکٹھا کرتی رہی۔ عصر کے بعد قارخ ہوئی تو پھر میری ایک ڈھارس اس نے ماسٹری کو دینے کی کوشش کی۔

”آپ چکی بیوی ہو، اپنا تن کیوں چھوڑتی ہو؟ میں آپ کو کوشلے جاتی ہوں۔“

”اوسے نہیں اللہ رکھی! شہر میں جا کر کیا کروں گی، بس میں خوش ہوں کسی فیصلے پر تو

بچی، فیصلے کے بغیر انسان لگتا رہتا ہے، جھوٹا رہتا ہے۔“ ماسٹرنی نے اس کی تسلی منونیت بھرے لہجے میں رکھ کے واپس اسے تھما دی۔

”پر۔۔۔۔۔“

”کوئی پرور نہیں، یہ دیکھ کچھ کپڑے اور دوسری چیزیں تمہارے لیے ہیں یہ لے جانا۔“ ماسٹرنی نے اپنے دائیں ہاتھ رکھی کپڑے کی پوٹلی کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔ اس کی چپ، طولی کی واپس آئی تو ابانے بھی اس کی اُداسی بھانپ لی۔

”پترا! یہ زندگی بڑی اچھی شے ہے، اس پر کیا کڑھنا؟“ اما کی بات سن کر بھی اس کی اداسی میں کمی نہ آئی بظاہر وہ چلے جلا کے روٹی پکانے میں مصروف ہو گئی۔ مگر دول بھجا بھجا سا تھا۔ ماسٹرنی کے ساتھ کافی وقت گزرنے کے بعد دور جانے کا احساس اسے دھکی کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ویسے بھی اس کا تھا ہی کون؟ وہ اکیلی سی پڑ گئی تھی۔ بلا وجہ ہی گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا بڑھ رہا تھا۔ مغرب کی اذان سن کر بے دلی سے اٹھی اور لائین جلانے کے لیے آگے بڑھی تو ابانے کہا۔

”اللہ رکھی! پترا تو خوش ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتی؟“

”ابا! مجھے تو اب بتا چلا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔“ اس نے حق کی بو بھرا کر کہا۔

”باگل تیرے جیسے ہوتے ہیں، مجھے تو بہت پہلے سے پتا تھا کہ تو خوش نہیں ہے، تجھے خوشی کا لگان ہی نہیں ہے۔“ ابا نے زہر سے کہا۔ وہ چپ چاپ اپنی چار پائی پر پاؤں سکیڑ کر لیٹ گئی اور چھت کی کڑیاں گھورنے لگی۔ ابا کو کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی، یاد آیا اب کو تو بخار ہے۔ وہ ان کی دوا بھی نہیں لائی تھی۔

”ابا! میں تیری دوائی لے کے آتی ہوں۔“

”اونٹیں او پترا! اب بخار نہیں ہے، تو کدھ دی نہ جا۔“ انہوں نے اپنی طرف سے خاصی طاقتور آواز کا سہارا لے کر اسے تسلی دی۔ وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ اب اسے حاکم کا انتظار تھا کہ شاید وہ آجائے مگر اس کے انتظار کو نیند آ گئی۔ حاکم نہ آیا۔

ماسٹرنی کے بعد وہ فارغ ی فارغ تھی۔ گھر کے چھوٹے نمونے کام کرنے کے بعد ابا کے پاس بیٹھ جاتی وہ اب پہلے کی طرح باتیں نہیں کرتے تھے، وہ طولی کی اٹھ کر بھر اندر باہر چلے گئی۔ بیٹے سے زیادہ ہو گیا تھا حاکم کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ پہلے دو تین بعد چکر لگا لیتا تھا مگر

اب تو رسواں دن تھا وہ خاصی مشکور سی تھی۔ چاہتی تھی کہ باہر جا کر پتا کرے مگر اسی وقت محلے کی دو تین عورتیں آ گئیں۔ اللہ رکھی انہیں پہچان نہ سکی کیونکہ وہ یہاں کی نہیں تھیں۔۔۔۔۔ وہ اس کے پیروں پر جھکیں اور منت آ مز لہجے میں ایک ساتھ بولی۔

”حضرت لی لی! اللہ آپ کا ربہ بلند کرے، پیر حاکم شاہ سے دعا کرادو، چوہدری ہماری زمین کا قبضہ چھوڑ دے، ہم در بدر پھر رہے ہیں، کسی نے پیر سائیں کا بتایا۔ ہم بہت امید لے کر آئے ہیں۔“ اللہ رکھی جو پترا کے بت کی طرح ایک ہی جگہ جمی کھڑی تھی جھکے سے پرے ہو گئی اور کچھ ناگوار سے اعزاز میں بولی۔

”میں اللہ کی بندگی ہوں، ایسے مت کرو، یہاں پیر حاکم نہیں آتے، دربار چاکرلو، جاؤ۔“ اسے حاکم کے نہ آنے کا جو غصہ، رنج تھا وہ ان عورتوں پر نکال دیا۔۔۔۔۔ وہ چپ چاپ چلی گئیں تو وہ وہیں کسرے کی چوٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے پہلی بار بہت بُرا لگا تھا۔

اس واقعے کے بعد حیدر پانچ چھ دن گزر گئے۔ حاکم کی کوئی خبر نہیں تھی اس نے صبر کی سل سینے پر رکھ لی تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ کسرے میں ٹھنکن کا سا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی اور ابا کی چار پائیاں باہر صحن میں نکال لیں۔ باہر کے فرش پر پانی کے لیے جھڑکا ڈرنے سے سوئحی سوئحی مٹی کی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے ابا کے لیے روٹی پکائی۔ مگر انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ان کی طبیعت عجیب تھی خاموشی کا گاہیں۔ آسمان کی طرف جمی تھیں۔ مغرب کی اذان ہو گئی۔ اس نے لائین جلائی، مغرب کی نماز پڑھی اور پھر اپنی چار پائی پر لیٹ گئی۔ ذرا سی آنکھیں بند کی تھیں کہ کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ دروازے پر جب کسی جھکی سی دستک ہوئی تھی تو ابا کی ساری توجہ دروازے کی طرف چلی جاتی تھی۔ مگر آتی تھی زور دار دھڑ دھڑ کے باوجود انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ لائین ہاتھ میں اٹھا کر دروازے پر پہنچی۔ تو پیچھے سے اکھڑی سانس کے ساتھ ابا کی آواز آئی۔

”اوئے، اوئے باہر میری ہے، پترا ذرا سنبھل کے۔۔۔۔۔“ وہ کچھ نہ سمجھی کیونکہ دروازہ تو مسلسل بج رہا تھا۔ ساتھ میں بہت سی ملی جلی آوازیں تھیں۔ وہ اور ذرا دیر تک دروازہ نہ کھلتی تو یقیناً دروازہ توڑ دیا جاتا۔ دروازہ کھلنے کی لائین کی زور روٹی میں سب سے آگے ایک بوڑھی عورت روٹی بیٹھی دکھائی دی اس کے دائیں بائیں دو پولیس والے تھے اور پیچھے

گاؤں کے بہت سے بیرو جوان جو اسی کوشش میں ہوتے ہیں کہ کہیں ہائی دہائی کے موقع پر خاموش تماشائی بن سکیں۔ وہ ہکا بکا سی تہی کر وہ عورت سیزہ جیتی ہوئی چلائی۔

”بہن! ہے اس مردوڈ باجیر کی گھر والی..... ہائے جو میرے معصوم مستولنگ کا قاتل ہے۔ ہائے میرے ربا! ایسے دھوکے بازوں کو تو کھلی چھٹی دے دیتا ہے..... ہائے، ہائے میں لٹ گئی۔“ وہ دہائی دیتے دیتے پکڑا کر گر گئے لگی تو بالکل پیچھے کھڑے دو نو جوانوں نے اسے سہارا دیا..... وہ ہوتی بنی اب تک کچھ نہیں سمجھی تھی کہ ایک پولیس والا جس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے آگے بڑھ کر بولا۔

”بی بی! کدھر ہے وہ جعلی پیر؟ اس غریب دہائی کا ملنگ بیٹا مستو، حاکم پیر کے حجرے کی دیوار کے پیچھے سے مردہ ملا ہے..... پہلے بھی ایک بچہ دربار کے پیچھے والے کھیت سے مردہ ملا تھا۔ ہمیں اسی حالت میں ملا ہے۔ حاکم پیر غائب ہے تم ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہاں چھپا ہے.....“ وہ ستانے میں آگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پلٹ کر کہا کہ طرف دیکھا مگر اندر سے میں کچھ دکھائی نہ دیا..... زبان میلوں حلق کے اندر رات گئی..... کیسے ہوئی؟

”بول بی بی! انہم ضائع نہ کر جلدی بتا، ہم اس ڈبا..... میری کچ چوار ہے پر کھال کھینچ لیں گے۔“ پولیس والے نے منہ سے کہا مگر وہ پھر بھی کچھ نہ بول سکی..... بولتی بھی کیا۔

”صاحب بی! چوروں کے سامھی بھی کبھی بولے ہیں، آپ اسے ہی لے چلیں، وہ خود بخود آجائے گا۔“ دوسرے پولیس والے نے غصے دی..... وہ تب بھی چھرائی آنکھوں سے فٹہ دیکھتی رہی۔

”جہاں بی بی! آگے لگ، جب تک وہ نہیں ملتا، تجھے سرکاری مہمان رہنا ہوگا۔“ پہلے پولیس والے نے اسے دھکا دے کر آگے چلنے کا رستہ دکھا مگر وہ دوڑ کے پیچھے آئی اپنے ابا کے پاس لائین اٹھا کے ان کے منہ کے پاس کی۔ کچھ کہنا جا کر کہا کہ اب تو میری کے خوف نے سانس ہی کھینچ لی تھی۔ لائین سر دیکھتا ہے ہاتھ سے نکلی، چھٹا کا ہوا اور اور گھور اندھرا چھا گیا۔ لیکن ابانے اسے روشنی کرنے کا نہیں کہا۔

کوزہ

وال کلاک سے نظریں ہٹاتے ہوئے غیاث صاحب ٹھکے۔ سفید بے داغ خالص ریشم کے سوٹ میں لاج بیگم کا ربع الجھا الجھا اور بالک پن بچھا بچھا سا تھا۔ غیاث احمد کے لیے یہ غیر متوقع، غیر معمولی انداز تھا حالانکہ بڑی دیر سے چرخہ تو ان کے اندر چل رہا تھا کوئی دھیرے دھیرے پچھلے ڈیزل کھٹنے سے دل کی ڈورسوت کی مانند کات رہا تھا۔

وہ پہلی مرتبہ خود کو بے وقت اور بے کار سمجھ رہے تھے۔ اکیس سال سے جس آرام گاہ کی ہر شے سے رسم و قاعدا بھا رہے تھے آج اُس کی ہر شے ڈھنڈلی اور بدوضع لگ رہی تھی۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا چائے کاگ بھاپ اُڑا اُڑا کر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ سگار کے منہ سے سرد راگ نکل نکل کر اینٹیں اُڑے میں جمع ہوئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتی لاج بیگم شیشا سی گئیں۔ وہ تو ہمیشہ کی طرح چائے کاگ بھیج کر بنی سکرانی خاندانی معاملات زیر بحث لانے کے لیے آئی تھیں، مگر انہیں کس قسم وال کلاک کی مویوں میں خود کچھ کر پُپ ہو گئیں۔

”کیا بات ہے لاج بیگم؟“ وہ اوپر ہی دل سے مسکرائے۔

”یہ ہی تو آپ سے پوچھتا ہے۔“ وہ اٹلا سوال داغ کر دیکھنے لگیں۔

”شاید بہت کچھ ہے اور شاید کچھ بھی نہیں۔“ وہ کہیں باپال میں اُتر گئے تو وہ کھینچ کر باہر نکال لائیں۔

”غیاث احمد! ایسا کیا ہے اُس میں؟ جو آپ بولیں ڈسٹرب ہیں۔“

”زندگی! زندگی کے سب رنگ ہیں اُس میں، تم نے نہیں دیکھے کیا؟“ وہ سادگی

سے بولے۔

”میں جانتی ہوں اُس کی آڑ میں تمہیں کون یاد آ رہا ہے؟“ وہ زبردست لہجے میں بولیں۔

”جس کا ذکر تم کر رہی ہو، وہ تو ساتھ ساتھ ہے، یاد تو مجھ لے والوں کو کیا جاتا ہے۔“ وہ بیزار سی سے کر دت بدل کر لٹ گئے۔

”میری بات سنو! میری طرف دیکھو غیاث احمد! یوں انگوروں پر کھینچ کر تم سکون سے نہیں لیٹ سکتے۔“ وہ ان کا بازو جھنجھوڑ کر چلا گئیں۔

”تم مان کیوں نہیں ملتیں کہ تم خود بھی اندر سے خوف زدہ ہو، افسردہ ہو، اس نے تمہارے اندر بھی پھیل چادی ہے۔“ وہ پلٹ کر سنجیدگی سے بولے تو لاج بیگم لمحہ بھر موگڑ بڑا گئیں، مگر پھر سنبھل کر بولیں۔

”ایک پرانے بچے کے لیے میں ایسا کیوں سوچوں؟“

ہونہار! بچے اپنے پرانے نہیں ہوتے صرف بچے ہوتے ہیں معصوم، بے ضرر بالکل اس جیسے جو جھولا جھولتے ہوئے، ہنر گھاس پر سرخ فٹ بال سے کھیلنے ہوئے بار بار اپنے باپ کو زور سے چلا کر ایک ہی بات کہتا ہے۔

”ڈیڈی! بس ایک منٹ اور.....“ ایک منٹ ایک منٹ کرتے آپ نے اتنی دیر کر دی ہے۔“ وہ باپ کے مزاج سے آشنا ہے، اٹھلا کر پھر ایک نعرہ لگا دیتا ہے۔

”ڈیڈی! جائیز ایک منٹ!“ وہ کھوئے کھوئے بول رہے تھے۔

”اس بچے نے تمہارے خوابیدہ ارمان جگا دیے ہیں۔“ لاج بیگم نے ایک دم کرب ناک لہجے میں کہا تو وہ تصویر کی دنیا سے لوٹ آئے۔

”نہیں لاج بیگم! اولاد کا اقرار مان کھی خوابیدہ نہیں ہوتا۔ یہ بیدار جذبے کا نام ہے بس یوں کہہ لو کہ میں اکیس سال سے اداکاری کر رہا تھا۔“ وہ بولے تو لاج بیگم پھرا گئیں۔

”کیا..... اداکاری؟“

”ہاں! اداکاری..... جہیں خوش رکھنے کی اداکاری، اپنے زندہ رہنے کی اداکاری!“

وہ ذرا روانی سے کہہ کر بیڈ سے اٹھے اور بیروں میں سلپرز ڈال کے باہر نکل گئے، اور لاج بیگم کے دل و دماغ کی سب کھڑکیاں اور دروازے جھٹکے سے کھل گئے۔ تیز تند ہواؤں نے شور برپا کر دیا۔ نیم واہونٹ اور حیرت سے کھلی آنکھیں لیے وہ غیاث احمد کی پہلی بے باکی پر سوچ رہی گئیں انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ اتنے زمانے گزرنے کے بعد غیاث احمد کر دت لے کر بیدار ہو جائیں گے اور پوری جرأت سے پچھل تمام خاموشیوں کو اداکاری کا نام دے دیں گے۔

”اس کا مطلب ہے غیاث کو اولاد کی اتنی تنہا ہے، پھر تو غیاث کو میرے وجود سے نفرت ہوتی ہوگی.....“ اس کے قہر قہراتے لب بولے، اسی اثناء میں غیاث واپس کرے میں آ گئے۔ انہیں اس طرح پریشان دیکھ کر کچھ استفسار نہیں کیا، اپنی رانگنگ ٹیبل کی طرف بڑھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

”غیاث! غیاث! تم نے اداکاری کی، جموٹ بولا، کیوں؟“ لاج بیگم بجلی کی سی پھرتی سے لپک کر ان کے پاس جا کر بولیں۔

”تم ابھی تک وہی جی ہو، جہاں چھوڑ گیا تھا۔“ وہ دھمے سے لہجے میں بولے۔

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے، برسوں کا اعتماد چکنا چور کر دیا۔“ وہ رو دیں۔

”لاج بیگم! افسانہ، نہ بناؤ، کس اعتماد کی بات کرتی ہو تم نے کب اعتماد کا رشتہ قائم کیا۔ تم نے اس حویلی کی طرح مجھ پر حکومت کی ہے اور میں نے ایک معمولی اکاؤنٹنٹ نے تمہاری دولت کی غلامی قبول کی ہے۔“ وہ ایک دم ہی شیعہ کی سے دل کی بات کہہ گئے۔

”کیا کیا..... کیا نہیں کیا میں نے تمہارے لیے، کس شے کی کمی چھوڑی، بولو.....؟“ وہ آ پے سے باہر ہو گئیں۔

”دھیرج لاج بیگم! ملازمین سنیں گے تو کیا سوچیں گے، انہوں نے آج تک میری آواز نہیں سنی، تم نے اس شیشے کے گُل میں ہر شے جمع کر رکھی ہے مگر وہ زندگی، وہ رنگ اور روشنی نہیں ہے اس شیشے میں۔“

”تو تم مجھے بے اولاد ہونے کا طعنہ دے رہے ہو؟“ وہ سراپا سوال بن گئیں۔

”نہیں..... میں تو بس ویسے ہی احساس محرومی کا ذکر کر بیٹھا، تم دل پر نہ لو..... اولاد کی خوشی ہماری قسمت میں تھی ہی نہیں۔“ غیاث احمد نے لہجے کو صبر کے گھونٹ پلائے مگر سرد آہ لاج بیگم کی روح میں اتر گئی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

پھر یہ واقعہ ان کی جان کا روگ بن گیا، شادی کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد غیاث احمد نے انہیں بتایا کہ وہ اداکاری کر رہے ہیں۔ اکیس سال سے ایک چھت کے نیچے رہتا ان کی اداکاری تھی۔ یہ سوچ سوچ کر وہ ہراساں ہو رہی تھیں۔ اپنے غامی وجود کا احساس، ادھر سے چن کا احساس پہلی بار ہو رہا تھا بھل و بھل، غم آلود چٹکوں کے ساتھ کبھی وہ حویلی کے ایک کمرے میں جا تیں اور کبھی دوسرے میں، غیاث احمد کو کئی روز یہ اندازہ نہ ہو سکا۔

وہ طبیعت کی خرابی کا کبھدہتیں اور وہ چپ چاپ ٹیکٹری چلے جاتے، حسب معمول دوپہر آ کر کھانا کھاتے اور آرام کرتے پھر شام کو واک کے لیے چلے جاتے۔ شام کی واک تو آسکین کی طرح ان کے لیے ضروری ہو گئی تھی خاص کر جب سے وہ باپ بیٹا پارک میں آنے لگے تھے۔ جاتے تو وہ پہلے بھی تکتے لیکن جب سے وہ باپ بیٹا آنے لگے تھے تب سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ واک کرتے ہوئے ان دونوں کی باتیں سننے، ان کی نوک جھونک سے لطف اٹھانے، خاص کر پیارا سا بچہ جس کا نام بی بی تھا جب بھاگتا دوڑتا، کھلتا کودتا ان کے قریب سے گزرتا تو ان کا دل چاہتا کہ وہ اسے روک کر گلے سے لگا لیں، ڈھیر سارا پیار کریں، اپنے نقشہ جذبول کو تسکین پہنچائیں لیکن اس کے والد کے چہرے پر پھیلے بے قرار جذبے ان کو روک دیتے اور ایک طویل سرد آہ بھر کے وہ بھرا آہیں اٹھائی، انہیں اپنی بامراد کی احساس ستانے لگتا ایسے میں کلایاں ماتا کا نشان ان کی نظروں کے سامنے آ جاتا جسے دس سال پہلے حالات نے بے یار و مددگار کیا تھا اور انہوں نے داس شفقت واکر کے اسے سمٹ لیا تھا۔ مگر ان کی فرط سرت اس لمحے میں مل گئی جب لاج بیگم نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کس کا گند اٹھالائے ہو؟“ ان کا کلیجہ دکھ سے بھر گیا۔

”یہ گند نہیں، دیکھو کتنا خوبصورت بچہ ہے؟“ انہوں نے کمال ضبط سے مسکرا کر پچھ

لاج بیگم کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہی ہوں، مگر یہ آپ کی آغوش میں اور میری حویلی میں کیوں ہے؟“ انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔ تب وہ کچھ گھٹے کر اس ننھے بھول کو لاج بیگم کی قبول نہیں کریں گی، مگر پھر بھی انہوں نے کوشش کی اور بتایا کہ یہ ٹیکٹری کے نو نوں کا بچہ ہے وہ دونوں میاں بیوی بس ایک سیڈنٹ میں سرگئے ہیں، یہ بچہ تنہا ہے کوئی سنبھالنے والا نہیں۔“

”اس لیے آپ اٹھالائے۔“ ان کی بات کاٹ کر وہ طرے سے مسکرائیں۔

”ہمیں اس کی صورت میں اولاد کا پیار مل جائے اور.....“

”اور کچھ نہیں غیث احمد! ہمارے اے اے اس لیے نہیں کہ ہم لاوارث بیچے لا کر جمع کرنے لگیں۔ آپ کو بابا سائیں نے لاوارث سمجھ کر نہیں، جنتی اور ایمان اور بدرجہ کہ میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ کس شے کی کمی ہے تمہاری زندگی میں۔“ لاج بیگم نے قطعی انجینیت کا مظاہرہ کیا تو وہ دل مسوں کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس بچے کا کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ خدای، خود پسند لاج بیگم

اسے کبھی یہاں رہنے نہیں دیں گی۔

مگر اس پر غور کرتے ہوئے دو ماہ گزر گئے انہوں نے اس کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری خود اٹھا رکھی تھی کیا پھر اک پرانے ملازم دلی محمد کے لیے بھرپور وقت دینا لازمی ضرورت تھا۔ جس پر لاج بیگم سخت ناراض رہتیں، ان کی موجودگی میں تو پھر کچھ برداشت کر لیتیں لیکن جوں ہی وہ حویلی سے باہر جاتے دلی محمد کو ان کی سختی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی کش مکش میں مزید دو ماہ گزر گئے، غیث احمد کے دل میں ننھے کا نشان کی محبت بڑھتی جا رہی تھی انہوں نے اس کے کمرے میں دیا جہاں ان کے چھوٹے بڑے قیمتی کھلونوں کے ڈھیر لگا دیے تھے، کپڑوں سے الماری بھری تھی۔ لاج بیگم نے دیکھ دیکھ کر سخت پابوس مگر غیث احمد اپنی خاموش مصلحت پسند فطرت کے باعث چپ رہے، ہر گھر سرد رو یہ نظر انداز کر دیتے تو لاج بیگم کو یہ بات بھی سخت ناگوار گزرتی۔ وہ چلا اٹھیں۔

”میرے بابا سائیں نے یہ خوب صورت حویلی یتیم، لاوارث بچوں کے لیے نہیں بنائی۔ میرے حزان کو سمجھتے ہوئے بھی تم نخل میں ٹاٹ کا پیوند لگا رہے ہو۔“

”بہت نادان ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ جس نخل میں پیوند لگانے کی گنجائش اور ضرورت موجود ہو وہ کسی قدر سستا اور بے وقعت ہوتا ہے۔ اسے پیوند کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم خواب کا ہو یا ٹاٹ کا، پیوند تو پیوند ہوتا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ غصے سے کھول گئیں۔

”دیکھو! یہ حویلی جی اٹھی ہے، کا نشان کی آواز نے رنگ بھر دیے ہیں، تمہیں محسوس نہیں ہوتا۔“ وہ پوچھتے تو وہ جھلا کر چل دیئیں۔

دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے غیث احمد نے بہت کوشش کی کا نشان کے لیے جگہ بنانے کی، مگر لاج بیگم کا دل نہ نیچا۔ ہر وقت اس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا رہنے لگا تب غیث احمد کو دل پر پتھر رکھ کے سوادہ سال کا نشان کو ویلیفیر ٹرسٹ کے حوالے کرنا پڑا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ بہنوں نہیں سمجھتیں سخت ڈسٹرب رہے، اس کی محبت دل کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی اس لیے بے قرار ہو کر وہ رو پڑے، مگر لاج بیگم بہت مطمئن اور خوش تھیں۔ ان کی دل جوئی میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے لگیں لیکن انہیں ایسی چپ گلی تھی کہ ایک روز وہ دھمے سے کہہ اٹھیں۔

”آپ نے معمولی سے ٹیکٹری ملازم کے بچے کے لیے جوگ لے رکھا ہے، پوچھ

نکئی ہوں، کیوں؟“ انہوں نے چند لمبے بنا پکیں جھپکے انہیں دیکھا اور اتنے دنوں کے بعد ہو لے سے مسکرا دیے۔

”شکر ہے آپ مسکرائے تو.....“ انہیں اطمینان سا ہوا تو خود بھی مسکرا کر بولیں۔

”اغا! لاج بیگم! مجھے مسکراتا ہی پڑا، تم نے اپنی مرضی سے اداس رہنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ کچ کبھی ہو فیکٹری کے معمولی سے ملازم کے بچے کی بساط ہی کیا ہے کہ اس کے جانے کا غم محسوس کیا جائے، میں نے تمہارے دل کی بات سمجھ لی ہے۔“

”جانے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟“ وہ ان جان بن کر سفید کرکھائی والا دو پناسر پر جماتے ہوئے بولیں اور غیاث احمد رخ موڑ کر اس کی یاد میں کھو گئے جسے بھول جانے کی یقین دہانی انہوں نے لمبے پہلے لاج بیگم کو کرائی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتے کہ دل میں رہنے والے دل سے نہیں نکلتے۔ کاشان کی معمول صورت ان کے ذہن سے اور اس کی دالہا نہ محبت ان کے دل سے کیسے کھل سکتی تھی۔

اور پھر غیاث احمد نے کاشان کو اپنے لیے اپنے دل میں رکھا۔ خود کو پہلے کی طرح کام کاج میں مصروف کر لیا۔ لاج بیگم مکمل مطمئن ہو کر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئیں وقت کے بھاری قدموں تلے آٹھ سال گزر گئے سمجھ دیے کا دیا تھا سوائے اس کے کہ لاج بیگم کے بانک پن اور کدفر میں وقت نے عمر کی سبز حائل چڑھنے کے باعث سلوئیں بھردی تھیں مگر جاہ و جلال اسی طرح تھا جب کہ غیاث احمد نے دھیمے لہجے میں بروہی عمر کا دھار اور زیادہ شامل کر لیا تھا۔ وہ زیر لب مسکراتے اور دھیمے لہجے میں بات کرنے کے ہمیشہ سے عادی تھے۔ جانے کیوں تھوڑا سا طنز اور تھوڑی سی عجزی نے ان کی آواز بلند کی تھی اور اس کی وجہ وہ احساس عجزی تھا جو ان کی ایکس سالہ شادی شدہ زندگی پر محیط تھا اور جس میں ارتعاش پارک میں کھیلنے والے سنی سے پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس سے بے پناہ افس سنا محسوس کرنے لگے تھے..... اس کی وجہ سے واک کے لیے باقاعدگی سے جانے لگے تھے وقت بھی زیادہ کر دیا تھا جبکہ مرتبہ وہ لاج بیگم کو اصرار کر کے واک کے لیے ساتھ لے گئے، شاید وہ انہیں سبھی سنی کے وجود کا احساس دلانا چاہتے تھے مگر اس کا الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

آج صبح سے وہ فیکٹری میں بہت زیادہ مصروف تھے، میز پر فائلوں کا انبار تھا۔ سٹکس کبھی کا وفد آیا ہوا تھا، انہیں فیکٹری کا وزٹ کرا کے لے کر لایا اور یوں شام کے چار بج گئے۔

جب گھر پہنچے تو لاج بیگم گرم جوڑی سے منتظر پائی گئیں۔ انہیں خاصی حیرت ہوئی لیکن وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے گئے۔ وہ بھی پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئیں۔

”خیریت ہے لاج بیگم!“ غیاث احمد نے جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

”ہوں، ہاں! بالکل خیریت ہے، چائے منگواؤں۔“

”تم بھول رہی ہوں، چائے میں واک سے آ کر پیتا ہوں۔“

”آج آپ واک کے لیے نہیں جائیں گے؟“ وہ فیصلہ کن انداز میں مخاطب ہوئیں۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”آج آپ دیر سے آئے ہیں، میں نے ضروری بات کرنی ہے اس لیے۔“ وہ فیروزہ کی انگوٹھی انگلی میں گھماتے ہوئے بولیں۔

”ابھی میں واک کے لیے جا رہا ہوں۔ واپسی پر بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ ٹریک سوٹ اٹھا کر واش روم میں ٹمس گئے۔ لاج بیگم ہونٹ چبانے لگیں۔

”ایک دن آپ اس کو نہیں دیکھیں گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“ جوں ہی وہ واش روم سے باہر آئے تو انہوں نے کہا۔

”کیا میری چھوٹی سی خوشی بھی تم سے برداشت نہیں ہوتی؟“ انہوں نے اس طرح سوال کیا کہ وہ سرمنڈھ ہی ہو گئیں۔

”ہو سکتا ہے مجھے آپ کی خوشی کے لیے ہی کوئی بات کرنی ہو۔“

”تو ٹھیک ہے، میں جلد آ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے جوگر پہننے اور اپنا موبائل فون، گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کونہ دیکھنا ان کے اختیار میں نہیں تھا ان دونوں باپ بیٹا کی دلچسپ باتیں انہیں ابھی لگتی تھیں۔

اور یہی بات لاج بیگم کو ابھی نہیں لگتی، وہ ہر قیمت پر غیاث احمد کو پارک جانے سے روکنا چاہتی تھیں مگر وہ چاہتے تھے ان کے لیے لاج بیگم کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ تو محو ہو گئے تھے سرخ سفید سنی کی بھگا دوڑ میں، آج سنی کے باپ کی آنکھوں پر سرخ اور نیلا چپک دار رد مال بندھا تھا۔ سنی سنی سے پیچھے کی کوشش میں گم تھا۔

”ڈیڈی! میں یہاں ہوں، مجھے پکڑیں۔“

”نانی بوائے! جھٹ ویٹ، ابھی پکڑا ہوں۔“

”آپ مجھے کسی نہیں پکڑ سکتے۔“ سنی قہقہہ لگاتا ہوا گئے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ کچھ دیر اس کے والد ہاتھوں کے اشارے سے دائیں بائیں اسے پکڑنے کی کوشش میں لگے رہے اور پھر ہتھیار ڈال دیے۔

”سنی یار! اب آ جاؤ، ڈیڑی ہار گئے۔“ انہوں نے رومال کھولا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ تب سنی کی آواز آئی۔

”ڈیڑی! بس ایک منٹ!“ اور بیشک کی طرح وہ اچھلتا کودتا دور چلا گیا۔

غیاث احمد دھیرے سے مسکرائے اور اپنے دانگ ٹریک پر چلے گئے یہ لمحے ان کے خون کی گردش میں شامل ہو گئے۔ واپسی پر انہیں پرسکون دیکھ کر لاج بیگم کمرے میں ہی آ گئیں، حسب معمول ان کے ساتھ ہی چائے آ گئی۔

”بہت خوش لگ رہے ہیں۔“ ان کی طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے وہ بولیں۔

”ہاں! شاید! اس کی شراقتیں ہی کمال ہیں۔“ انہوں نے چائے کی چمکی ایسے ذوب کر لی کہ لاج بیگم کو سفید یقین آ گیا، مگر اس یقین میں افسردگی کا عنصر نمایاں تھا۔ بے چینی اور اضطراب تھا۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ لاج بیگم نے کافی تنجید کی سے کہا۔

”کر، اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”آپ کو جس عروسی کا ب شدت سے احساس ہو رہا ہے وہ دور ہو سکتا ہے اگر میری بات مان لو تو۔“ لاج بیگم میں آج اس لمحے بالکل نئی عورت نظر آ رہی تھی۔

غیاث احمد سنبھل کر بیٹھ گئے اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اس کے لیے میں آپ کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہوں۔“ وہ پھر گویا ہوئیں تو غیاث احمد کے سر پر کسی نے جیسے تھوڑا دے مارا، وہ لمحہ بھرتا ہوتی سے ہو گئے اور پھر زور زور سے قہقہہ لگانے لگے۔

”ہا، ہا، کمال کر دیا لاج بیگم! اللہ کا نام لو۔۔۔۔۔ حاتم کی قبر پر اس عمر میں لات مت مارو۔۔۔۔۔ آپ کا احسان عظیم ہوگا۔“ سنی منہ پر کے بے مشکل انہوں نے جملہ کیا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ وہ برہان لگئیں۔

”ٹھیک کہتی ہو، یہ تو مقام انفس ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئے۔

”مجھے احساس ہے کہ ہماری حویلی میں اولاد کی کمی کی وجہ سے روتی نہیں، مگر یہ روتی پارک میں کھیلنے والے بچوں سے نہیں ہو سکتی اس کے لیے آپ کو شادی کرنا ہوگی۔“

”لاج بیگم! احمقانہ باتیں کرنا اتنا بھی ضروری نہیں۔۔۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔“ انہوں نے کچھ سختی سے کہا تو وہ پھر گئیں۔

”کیوں! جس احساس عروسی کو آپ دل میں چھپائے ایکس سال سے اداکاری کر رہے ہو اس پر بات کیوں نہیں ہو سکتی؟ آپ کو اولاد چاہئے۔۔۔۔۔“

”مت گھیسو مجھے اور خود کو کائناتوں پر! یہ لٹچ یا ڈنڑ کا مینو نہیں جو اس طرح بتایا جائے۔“

”غیاث احمد! دوسری شادی کی اجازت میں دے رہی ہوں۔“

”کم آن! لاج بیگم! اپنے ہا اختیار ہونے کا ڈکھامت بجاؤ۔۔۔۔۔ مجھے تمہاری اجازت نہیں چاہئے، مجھے میرے مقام سے اس قدر مت گراؤ، کچھ میری حقیر رہنے دو۔۔۔۔۔ زلیست کے سرمائے میں اور کچھ نہیں ہے میرے پاس!“ وہ ذرا سادہ بلند کر کے ایک دم دھمکے بڑگئے۔

”دوسری شادی جرم تو نہیں۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”عمر کے اس مقام پر جرم سے کم بھی نہیں۔۔۔۔۔ اور ایسا کیوں کروں؟“

”اولاد کے لیے، اوروں کے بچوں کے دل بہلاتے ہو۔“

”ہونہار! میں تو جیسے سڑکوں پر دوسروں کے بچوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہوں۔“ وہ طرہ یہ بیٹے۔

”اور وہ بچہ۔۔۔۔۔ اور یہ پارک والا سنی! جو آپ کے اعصاب پر چھا گیا ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے بچے اپنی حرکتوں کی وجہ سے متوجہ کرتے ہیں اور بس، وہم نہ کرو۔“ انہوں نے لاج بیگم کو احسن طریقے سے ٹال دیا۔

”لیکن اب یہ میں چاہتی ہوں۔“

”ضروری نہیں کہ میں تمہاری یہ بات بھی مان لوں۔“

”غیاث احمد! اس میں کوئی برائی نہیں، ہماری بے شمار دولت اور جائیداد کا وارث

ہونا چاہئے۔“

”بہت دیر ہو چکی، اب مبر شکر کرو۔۔۔۔۔“ وہ اندھا کچے اسٹری روم کی طرف چلے گئے۔
پھر چند روز اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی، وہ ٹیکسری کے نئے یونٹ کی
انٹلائشن کے باعث بے حد مصروف رہے۔ لاج بیگم بھی کچھ مصروف تھیں، آتے جاتے
انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کہیں باہر ہیں مگر آج ان کے بہت قریبی دوست ان کے ساتھ تھے۔
وہ انہیں کھانا ساتھ کھانے لائے تھے مگر لاج بیگم نہیں نظر نہ آئیں تو گل بادشاہ سے پوچھا۔
”وہ تو گھر میں نہیں ہیں۔“

”کہاں گئی ہیں؟“ انہوں نے دوست کی موجودگی میں ہی پوچھا۔

”جانتی نہیں، صبح سے گئی ہوئی ہیں۔“

”اچھا کھانا لگاؤ ہمارے لیے۔۔۔۔۔ جو کچھ ہے لے آؤ۔“

انہوں نے کہا اور اپنے دوست کے ہمراہ کھانے کی میز کی طرف آ گئے۔ گل بادشاہ
نے دیکھتے ہی دیکھتے میز بھردی۔۔۔۔۔ کباب، چاول، سالن، دسی، سلاد، چٹنیاں سب موجود تھا۔
ابھی ماحول میں کھانا کھایا، بعد میں گل بادشاہ نے ابھی سی کافی پلائی۔ جب ان کے دوست
رخصت ہو رہے تھے۔ تب لاج بیگم آئیں، چادر اتار کر تھکی، ڈیٹا سینے پر پھیلا یا۔

”کہاں گئی تھیں؟“ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”لوڑی دیکھنے۔۔۔۔۔“ وہ رجوت پولیں۔

”پہلے اس گھر میں ملازمین کیا کم ہیں؟“ غیاث احمد نے ریموٹ سے ٹی وی آن

کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کس نے کہا کہ میں ملازمہ دیکھنے گئی تھی۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔“ مختصر پوچھا گیا۔

”میں آپ کے لیے لوڑی دیکھنے گئی تھی۔“ انہوں نے بے نیازی سے ان کی ساعت

پر ہم بھوڑا۔

”کیا۔۔۔۔۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، میرا اتنا شاکا ناغی باقی بچا ہے۔ ہوش کے

ناخن لو۔“ وہ چلا اٹھے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو اعتراف کیا ہے؟“

وہ ہنرک انھیں۔۔۔۔۔

”اعتراف بہت جھوٹا لفظ ہے لاج بیگم۔“

”میں تمہاری زبان کا پابند نہیں۔“

”ملاؤ ضد کا فائدہ؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”لاج بیگم! کوئی ٹکرنہ نہ کرو، کوئی دھم نہ کرو، میں کسی کا بچہ حویلی میں نہیں لانے والا جو
جاچکا ہے اسے بھی بھول گیا ہوں، اس لیے زندگی اخیرن مت بناؤ۔۔۔۔۔“

”اور وہ جو کرلاہٹ اور بچتی آپ کے اندر کروٹیں لے رہی ہے۔“

”وہ مجھن وقت کی ملکہ ہو گی اداکاری ہی تھی۔“ وہ ذرا سانس کر بولے۔

”لیکن اب آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔۔۔۔۔“

”ہرگز نہیں! آئندہ مت کہنا۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر اخبار پڑھنے لگے۔

”ایسا ہی ہوگا جیسا میں نے فیصلہ کیا ہے۔“ وہ بھی یہ فیصلہ صادر کر کے کمرے سے

باہر نکل گئیں۔

اس معاملے نے اتنی شدید اور عظیم صورت اختیار کر لی کہ دونوں کے درمیان بات
چیت تک بند ہو گئی۔ غیاث احمد کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ لاج بیگم سوتن لانے کے لیے اس قدر
ضد پرتہ آئیں گی، لیکن ان کا اندازہ بالکل غلط نکلا تھا وہ جب بات کرتیں تو اس موضوع پر
کرتیں ورنہ دونوں طرف گہری جاہد خاموشی تھی۔۔۔۔۔ غیاث احمد نے کچھ وقت کے لیے خاموشی
اختیار کر لی کہ معاملہ ٹھنڈا پڑنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن یہ سوچ بھی غلط ثابت ہوئی۔ اس
شام جب وہ ٹیکسری سے لوٹے تو لاج بیگم سر ہو گئیں۔

”آپ کو میرے ساتھ لوڑی والوں کے ہاں چلنا ہے تیار ہو جائیں۔“ یہ بات اتنی
غیر متوقع اور غیر معمولی تھی کہ وہ پکرا سے گئے۔

”لاج بیگم! میری خاموشی کو اندراشیتیت مت کرو تماشے کے لیے بازار میں بہت
سی اشیاء دستیاب ہیں میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش مت کرو۔۔۔۔۔“ انہوں نے سخت فیصلے
لہجے میں کہا اور کھٹ سے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا۔ وہ تپ انھیں۔

”آپ میری بے عزتی کر رہیں گے۔“

”اس گھر کی دیرانی میں، میرا بھی دم گھٹتا ہے۔ دروازہ کھولیں، آپ کو شادی کرنی
ہوگی۔۔۔۔۔ اس حویلی کو وارث چاہئے۔“ وہ مسلسل دروازہ کھینچتی اور چلاتی رہیں۔ جب کہ وہ

انہائی نکل سے ایڑی پیچڑ پر جموتے رہے۔

”اے خدا! اس عورت کو ہدایت دے۔“ انہوں نے دل سے دعا کی۔

کچھ دیر بعد دروازے کے باہر مکمل خاموشی ہو گئی تو انہوں نے واک کے لیے جانے کی تیاری کی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلے تو فی لادج سے گزرتے ہوئے ٹھکے۔ لاج بیگم صوفے پر گر کر سکیاں لے رہی تھیں ان کا بھاری، مجرا بھرا جسم جھک لے کھا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے لاج بیگم کو یوں ٹکھرتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر اپنے قدموں پر جتے وہ بہت کچھ سوچتے رہے کبھی قدم اس صوفے کی طرف اٹھتے۔ اور پھر کچھ سوچ کر واپس لے جاتے۔ ایسا کرتے تقریباً دس منٹ ہو گئے پھر فیصلہ کن انداز میں مضبوط قدم اٹھائے اور باہر نکل گئے اپنی دانت میں انہوں نے لاج بیگم کی خند کو شکست دی تھی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ یہ عروسی کا احساس ہی تو تھا جو کشاں کشاں انہیں کھینچنے لے چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہیں جا رہے تھے جہاں باپ بیٹے کی خوشیاں تھیں، شرارتیں میں فرق صرف اتنا تھا کہ طبیعت مکدوری تھی، گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچے جا رہے تھے کہ کیا لاج بیگم کے سامنے ہمیشہ کی طرح جھٹھا رہیں گے؟ کیا زندگی کو اس بچ پر یوں بھی آدھانا پڑے گا۔ ایک دم دل نے نفی میں نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے پارک کی پارکنگ میں جھٹکے سے گاڑی روکی، چند لمبے سراسیمگی پر رکے ہاتھوں پر ہٹا کر خود کو تارل کرتے رہے اور پھر گاڑی لاک کر کے پارک کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ سسرال ہوا نے، چپکتے پرندوں نے اور پھولوں کے غنچوں نے ان کا مسکرا کر استقبال کیا۔ وہ مخصوص دانگ ٹریک پر چلتے ہوئے پارک کے دائیں ہاتھ اسی صے میں پہنچ گئے جس میں سنی اور اس کے ڈیڑی ہوتے تھے۔ مگر عجیب بات تھی کہ سب منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ سنی اپنے ڈیڑی کا ہاتھ کندھے سے ہٹا کر دوسرے راستے پر بھاگتا چلا گیا اور اس کے ڈیڑی اس کے پیچھے دس پندرہ قدم بھاگے۔

”سنی! بیٹا رک جاؤ، مت جاؤ، میں تمہارے بنا کیسے جیوں گا؟“ وہ یہ کہتے ہوئے سفید پتھر کی پتلی پر گرے گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس انداز میں سنی کے ڈیڑی کو دیکھ رہے تھے۔ شناسائی کے تعلق کو ذہن میں رکھ کے ان کے قریب گئے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں، آپ کا بیٹا کہاں گیا ہے اور آپ۔“ غیاث احمد کی زبان

نے آگے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

”اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا ہے، میں نے بہت روکا مگر وہ کہتا ہے کہ اس کی ماں اسے فیصل آباد لے جانے کے لیے جا رہی ہے۔“ یہ بتاتے ہوئے ان کے چہرے پر صرف دھواں ہی دھواں تھا جب کہ غیاث احمد حیرت و استعجاب کی دنیا میں معلق تھے۔

”میں محترم آپ کی بات نہیں سمجھا، آپ کی بیوی سنی کو آپ کی مرضی کے بغیر لے گئیں۔“

غیاث احمد خود بھی بیچ پرک گئے، اس سے پہلے کہ وہ صاحب کوئی جواب دیتے سنی بھاگتا ہوا آیا اور چاروسو کے کنارے ٹوٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”انگل! یہ آپ کے باقی پیسے، میں نے اپنے سو روپے کاٹ لیے ہیں۔“

”سنو! سنو! سنی بیٹا! یہ سب رکھ لو، اور لے لو، مگر نہ جاؤ۔“ وہ صاحب سنی کے سامنے گڑ گڑانے لگے۔

”انگل! میری امی مجھے لے جا رہی ہیں، اب ہم فیصل آباد میں ہی رہیں گے۔ آپ یہ لیں اپنے پیسے پکڑیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ کسی کمرے کا درباری کی طرح سنی نے ان صاحب کے کوٹ کی سامنے والی جیب میں ٹوٹ پھنسا دیا اور بھاگ گیا۔

ایک مرتبہ وہ پھر اسے پکارتے ہوئے گئے۔ مگر سنی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ غیاث احمد یہ معاملہ کرنے کے لیے جلدی سے بولے۔

”یہ سب کیا ہے؟ یہ بچہ آپ کو انگل، اور ڈیڑی“

”جانے والا کرانے کا بیٹا تھا، سو روپے گھنٹہ صرف ڈیڑی کہنے کے لیے ہی تو طے کیا تھا۔“ وہ صاحب کھوئے کھوئے افسردگی سے بولے۔

”وہاں؟“

”یہ بچہ، سنی سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ اس نے بھیک کے لیے ہاتھ پھیلا یا اور میں نے اس کے مصمم چہرے میں اپنے تنہا بے قرار دل کا سکون دیکھ لیا۔“

”اس نے سو روپے گھنٹہ میرے نام کر دیا۔ دو سال سے میرے ساتھ روزانہ ایک گھنٹہ گزارتا تھا، مجھے ڈیڑی پکارتا تھا اور اب یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا وہ چلا گیا۔“

گرے شلوار سوٹ میں، سنہری قریم کی ٹیکنگ لگاے وہ سویرا انسان غیاث احمد کو

بہت دگلی لگا۔ انہیں ذاتی طور پر اس انوکھے انکشاف نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسی غیر متوقع بات سامنے آنی قحی کہ وہ گوگلو کی کیفیت میں تھے۔

”مگر اس معاملہ سے، اس شروط رہنے کی ضرورت! مجھے پوچھنے کا حق نہیں، لیکن جانے کیوں سنی کے جانے سے میں بھی بہت افسردگی محسوس کر رہا ہوں۔“ غیاث احمد نے کافی اپنائیت بھرے لہجہ میں کہا تھا اس لیے وہ صاحب دھکے سے مسکرائے اور بولے۔

”یہ دنیا ضرورت کی جگہ ہے، یہاں ہر شے کا رادار ہوتا ہے، مجھے بیٹے اور بیوی کی جدائی نے تنہا کر دیا تھا میرا اینٹا گل ریز خان، سنی کا ہم قہار تھا، وہ اور میری بیوی کا راکسیٹینٹ میں رخصت ہو گئے، مجھے ڈیڈی کہنے والا کوئی نہ رہا۔ میں پاگل سا ہو گیا، دولت جانیدا کسی میں دلچسپی نہ رہی، اور بس جانے کیوں اچانک سنی میری ویران دنیا میں آ گیا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ ایک گھنڈ جونی کے ہمراہ اس پارک میں گزرتا تھا یہ مجھے چھپیں گھنے آستین فرماہم کرتا تھا۔ ڈیڈی، ڈیڈی کا لفظ میری ساعت میں سرگوشیاں کرتا تھا۔ سنی اور اس کی بیوہ ماں کی زندگی سو روپے روز سے آسان ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے کاروبار کر رہے تھے اور میں اپنی ضرورت کے لیے۔“ وہ صاحب جیج غیاث احمد پر بھروسہ کر کے اپنے بارے میں بتاتے چلے گئے۔ شاید انہیں بھی روزانہ غیاث احمد کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا حالانکہ آج دونوں پہلی مرتبہ مخاطب ہوئے تھے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اور سنی؟“

غیاث احمد ہلکائے۔

”چھوڑیے جناب! وہ سب غیر حقیقی تھا، بالکل کسی فلمی سین جیسا، جس میں، میں اور سنی اداکاری کر رہے تھے۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھے اور دھیرے دھیرے چلنے لگے۔

غیاث احمد بھی اخلاقتان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے وہ پہلے ہی بے حد مضطرب تھے لاج تبیکہ کی باتوں کا گہرا اثر تھا ان کے دماغ پر، یہاں کی خوشی بھی معدوم ہو گئی تھی۔ داکہ کرنے کی کشش ہی ختم ہو گئی تھی، سنی کے معصوم سے وجود میں ددلوں کی دھڑکنوں کا احساس تھا یہ سنی نہیں جان سکتا تھا، وہ تو کرائے کے بیٹے کا رول ادا کر رہا تھا۔

”میں آپ کے نام سے بھی واقف نہیں، افسردہ ہوں کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب مجھ سے یہاں نہیں آیا جائے گا۔“ انہوں نے چلتے چلتے بتایا تو غیاث کے دل سے

بھی یہ آواز آئی۔

”شاید میں بھی اب نہ آ سکوں۔“

”مجھے غیاث احمد کہتے ہیں، آپ میں اور مجھ میں ایک قدر مشترک ہے کہ میں بھی سنی میں سانس لینے لگا تھا میرے گھر میں بھی جاہل سنا اور ویرانی ہے، میری کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں۔“ غیاث احمد نے بتایا تو انہوں نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور لمبے بھر کو رک گئے پھر قدم اٹھانے اور چلنے لگے۔

”مجھے نوریز خان کہتے ہیں، مجھے بیٹے اور بیوی کے بعد بہت کہا گیا، میری والدہ اب بھی کبھی کبھی کہتی ہیں میں اولاد کے لیے دوسری شادی کر لوں، مگر۔“ وہ مسکرائے جب کہ اب ٹھک کر رکنے کی باری غیاث احمد کی تھی۔ ان کے اندر کی بات نوریز خان نے جان لی تھی۔

”مگر۔“

”مگر یہ غیاث صاحب! کہ میرے بہت پیارے سے میاں جی تھے ہمارے گاؤں میں، مجھے قرآن کی تعلیم دینے والے بہت نیک اور پھلے انسان تھے، ایک مرتبہ شادی، شادی کی ٹکرائے سے اکٹرا کر میں گاؤں گیا تو سکون کی خاطر سیدھا میاں جی کے پاس مسجد پہنچا۔ کیا بتاؤں؟ وہ اس وقت بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے۔ میں گھبرا گیا اپنی سب باتیں بھول گیا، میں نے پوچھا۔

”میاں جی! کیا بات ہو گئی۔“ خیر تو ہے۔“

”اوئے نوریز پتر! غضب ہو گیا یہ میرا بیس سالہ دوست مجھے چھوڑ گیا۔“ وہ یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ میں نے دیکھا ان کے سامنے نیک مٹی کا لوٹا ٹوٹا پڑا تھا۔ وہ اس کے لیے رو رہے تھے مجھے بھی آگئی۔ میں ہنسا چلا گیا۔

”اوئے بیٹا! دوست کے چھڑنے پر ہستے نہیں ہیں۔“ انہوں نے ٹوکا تو میں ہنسنے پہنچے ہولا۔

”میاں جی! ایک روپے کے اس مٹی کے لوٹے کے لیے آپ رو رہے ہیں، پانچ منٹ میں یہاں لوٹوں کا ڈھیر لگا سکتا ہوں۔“

”شباباش ہے پتر! بڑا جگر آڑا ہوا۔“ پر تم کیا جانو اس مٹی کے کوزے میں کیا تھا؟“ وہ آنسو کندھے سے پرے رومال سے صاف کرتے ہوئے بولے۔

”ایسا کیا تھا اس لوٹے میں۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”اوئے جیٹا! اس نے میرا، میں نے اس کا ساتھ دیا ہم نے ایک دوسرے کو میں سال دیکھا ہے۔ نیا لوٹا نہ ہاتھ پر چڑھے گا اور نہ اپنا سا لگے۔ اسے اپنا کرنے کے لیے اور میں سال کہاں سے لاؤں گا؟“ میں جی نے ایسی بات کہہ دی کہ میں ساکت رہ گیا اور پھر چپ چاپ گھر آ کے میں نے ماں جی کو میاں جی کی یہ باتیں بتائیں اور انہیں خاموش کر دیا۔۔۔ شاید مجھ میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں نئے لوٹے کو آزماتا، یوں میں نے سنی کے احساس سے محبت کی۔

غیاث احمد اور زیادہ سکتہ میں آ گئے۔ نور یز خان نیاز کی برتنوں کی طرح کھلتے جا رہے تھے اور کتنی عجیب بات تھی کہ یہ بات بھی ان کے دل کو چھوٹی ہوئی گزری۔ ان کی مضطرب طبیعت کو قرار آ گیا۔ لاج بیگم کے سمجھانے کی راہ سوچھ گئی مگر ایسا کرنے کے لیے بھرپور اداکاری کی ضرورت تھی، اور اداکاری تو وہ برس با برس سے کرتے چلے آ رہے تھے نور یز خان سے زیادہ تجربہ کار تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ نور یز خان ان سے بڑے اداکار نکلے۔ انہوں نے پارک کے خارجی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ہاتھ لہرا کر الوداعی کیفیت کا اظہار کیا۔ نور یز خان نے جھللاتی نگاہوں سے انہیں اور پلٹ کر پارک کو دیکھا اور مسکراتے کی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ جب کہ غیاث احمد نے اس عزم کے ساتھ اپنی گاڑی اسٹارٹ کی انہیں باقی زندگی بہت بھرپور اداکاری کرنی ہے۔



چندا کے ابا

نور محمد نماز و تراویح پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو نور جہاں نے جلدی سے چنگیر اٹھائی، دیکھی کہ سالن پلیٹ میں نکال کر کمرے کا رخ کیا۔۔۔ اس کے اندر پہنچے تک نور محمد اپنی چار پائی پر لیٹ گئے تھے۔۔۔ اسے کھانا لاتا دیکھ کر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا مگر نور جہاں نے دیکھا ہی نہیں، ان کی چار پائی اور اپنی چار پائی کے درمیان چھوٹی سی پرانی آہنی میز پر چنگیر اور سالن کی پلیٹ رکھ دی۔ پانی کا جگ اور گلاس لے کر آئی تو انہیں کہنا پڑا۔

”کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی، پہلے پوچھ لیا کر۔۔۔“

”کیوں! باہر کچھ کھالیا کیا؟“ اٹھا بیس سالہ رفاقت میں پہلی مرتبہ اجنبی سوال کر کے نور جہاں نے شرمندگی محسوس کی اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے بولی۔

”میرا مطلب تھا سمجھ میں کوئی حرکت وغیرہ۔“

”میرا قصور نہیں ہے، عورت ذات کو زیادہ بولنے کی عادت ہوتی ہے۔“ اٹھا بیس سالہ رفاقت میں ایسا جواب بھی پہلی مرتبہ نور جہاں کے کانوں نے سنا تھا۔ وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

”میں نے تو دیے ہی کہہ دیا تھا کیوں کہ اس سے پہلے تم نے کبھی کھانے سے انکار نہیں کیا؟“

”ضروری تو نہیں کہ جو کام پہلے نہیں کیا وہ آدی اب بھی نہ کرے۔“ خاصا الجھا الجھا جواب تھا۔ نور جہاں کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟“ پر تشویش نظروں سے ان کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش شروع ہو گئی مگر وہ جھٹکے سے اٹھے اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیکن جس طرح روٹی کا ٹوٹا توڑ کر چند منٹ سائن کی پلیٹ کے حوالے کئے رکھا اس سے وہ کافی حد تک اعزازہ لگا چکی تھی کہ کوئی اضطراب ہے، کوئی بات ہے جو ٹوٹا پلیٹ میں ہے یا رد و گدگار پڑا ہے یا پھر خدا نہ خواست کہیں طبیعت تو..... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔

”چندا کے ابا! اگر طبیعت خراب ہے تو رہنے دو، میں چائے بنا دیتی ہوں۔“

”ارے نہیں، بھئی! آج پہلا روزہ تھا اظہاری میں تم نے پکڑے کھلا دیے، دو چار کھجوریں کھالیں، معمولات سے ہٹ کر کھانے پینے سے طبیعت ادب جاتی ہے اور تم جان کو آجاتی ہو، روزوں کی عادت مشکل سے بنتی ہے۔“ انہوں نے کچھ بیزاری سے کہا اور بادل نحوستہ دوسرا ٹوٹا اٹل منہ میں ڈالا۔

”اب عصر کے وقت دکان بند کر دیا کرو۔“ اپنی فہم کے مطابق نور جہاں نے شوہر کی بیزاری کا مل لگلا، جس پر انہوں نے اسے دیکھا اور کہا۔

”دکان میں ہے ہی کیا، خود بہ خود بند ہو جائے گی..... صبح سے شام تک بیٹھ کر بھی اصل زرعی لکھنا پڑ رہا ہے جتنا آنا، وال، مرجع معاملے ڈالے تھے سب ختم ہو گئے اور مال ڈالنے کی نوبت ہی نہیں آئی.....“ نور محمد نے تیسرا اور آخری ٹوٹا اٹل حلق سے اتار کے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ نور جہاں نے کھانے کے برتن ان کے سامنے سے اٹھائے اور واپس میز پر رکھ دیے۔

”منڈی سے ادھار مال لو۔“

ہونہر! یہ کہنا آسان ہے کون دیکھتا ہے آج کے دور میں ادھار! اب تو کہیں نوکری کی بات کرنی پڑے گی۔“ انہوں نے پاؤں پھیلانے تو نور جہاں نے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔

”رہنے دو، جا، جا کرو سوا۔“ وہ بولے۔

”وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی اسی دن روٹی تھی۔“ وہ بولی۔

”تو کیا برا کیا! چندا کی شادی کیسے کرتے؟ کیا تھا اور تیرے میرے پاس! بھوکی کنگلی ٹو، بھوگا نکاح میں۔“ پچھلوں نے اپنے نام کے سوا ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے؟“ وہ تلخ ہو گئے، نور جہاں کے لیے ان کا یہ اعزاز بھی بالکل نیا تھا۔ وہ بھی نمسے آ گئی۔

”چندا کو گئی بہن کے گھر بھیج رہے تھے وہ پکڑوں میں شربت کے پیالے پر رخصت کر دیتے۔“

ہونہر! سگی بہن! کس زمانے کی بات کرتی ہے تو؟“ وہ طنزیہ بولے۔

”اسی زمانے کی، بہن کو بھائی کے حالات نہیں پتا تھے کیا، مگر تم نے بہن کا گھر بھرنے کی سوچی۔“

”بے وقوف عورت! تجھے میں کیا سمجھاؤں؟ بس میری چندا خوش رہے اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کروت لینے لگے تو نور جہاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہاری بیٹی کی جگہ اللہ بیٹا دے دیتا۔“

”کیا! آج تو یہ بات کہہ دی آئندہ نہ کہنا، چندا میں میری جان ہے۔“ وہ ایک دم پھر کر بولے۔ نور جہاں جی کے لیے متا کے ہاتھوں دھکی ہو کر روٹی ہوئی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی، نور محمد نے گردن گھما کر دیکھا جب یقین ہو گیا کہ وہ کمرے میں نہیں تو طول سے ہو کر اٹھ بیٹھے۔ بیٹھنے سے سکون نہ ملا تو اٹھ کر ٹیبلے لگے مگر سامنے رکھی چندا کی تصویر کو جیسے زبان مل گئی۔

”ابا! میری پہلی عید آ رہی ہے، پھوپھو کہہ رہی ہیں کہ عیدی شان دار ہونی چاہیے۔“ وہ ایک تک تصویر کو دیکھ رہے تھے ان کی لاڈلی چندا کی خوب صورت تصویر بظاہر تصویر تھی سکت اور ہے جس! مگر کچھ دیر پہلے پورے پروتوہ اسے رندھی ہوئی آواز میں سن کر آئے تھے، وہ ڈری سبھی عید کی یاد دہانی کر رہی تھی، یہ بھول گئی تھی کہ باپ کو ماہ رمضان کی مبارک باد پہلے دینی چاہیے، مگر انہوں نے اس کے اطمینان اور تسلی کے لیے بہت کچھ کہہ دیا اور پوچھل دل کے ساتھ خان میڈیکل اسٹور والے کے ہاتھ میں کال کے پیسے رکھ کر نماز وتر اوتار کے لیے چلے گئے۔ اس وقت سے وہ سخت پریشان تھے، نور جہاں کو کیا بتانے کہ اتنا بڑا خرچا کیسے پورا ہوگا؟ انہوں نے تو چندا کے فون سے ہفتہ پہلے آنے والے حارہ آہ آپا کے فون کا بھی اس سے ذکر نہیں کیا تھا کہ انہوں نے کتنی آسانی سے یہ اطلاع دی تھی۔

”نور محمد! آخری صلا اس کے گل دی مٹائی کھائی اے۔“ نور محمد کی آنکھیں خوشی کے موتیوں سے بھر گئیں بیٹے روتے اپنے نانا بننے کی خبر سنائی، سب نے مبارک باد دی۔ نور جہاں کا انداز سب سے نرالا تھا وہ کچھ دیر سکت کھڑی لٹانے میں بچی چند جلیبیوں کو دیکھتی رہی پھر مسکرائی اور خاموشی سے اٹھا کر الماری سے وہ پوٹی نکال لائی جس میں مختلف رنگوں، ڈیزائنوں کے بہت سے چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے۔ انہوں نے استہنامیہ نظروں سے دیکھا، وہ

مطلب سمجھ کر بولی تھی۔

”ماں جب بیٹی کے جنم کے کپڑے تیار کرتی ہے تو ساتھ ہی بیٹی کی اولاد کے لیے چھونے بڑے کپڑے کے ٹکڑے جمع کر لیتی ہے، میں نے چنڈا کے بچے کے لیے کپڑوں کی تیاری کا سامان جمع کر رکھا ہے۔“ یہ سن کر نور جہاں کی سادگی پر انہیں ہنسی آگئی۔

”اس چنگی بھر تیاری پر بیٹی بیانیہ تھی۔“ ہنستے ہنستے وہ پوچھ رہے تھے، نور جہاں کچھ نہ سمجھی تو ایک لمبی سرد آہ بھر کے وہ جینٹک کی طرف بڑھ گئے جہاں انہوں نے پرچون کی دکان کھول رکھی تھی پھر کچھ دیر بعد سلائی مشین کی سسل آنے والی آواز پر وہ افسردہ سے، بے چین سے کچھ سوچتے رہے تھے۔

ابھی اس سوچ سے نکلنے کا کوئی راستا نہیں ملا تھا کہ چنڈا نے عیدی کے لیے یاد دہانی کرا دی، وہ اس وقت یہی سوچ رہے تھے کہ لاڈلی بیٹی کے لیے عیدی کا سامان کیسے خریدیں، کیا خریدیں اور کتنا خریدیں؟

پاس تو کوئی جمع پونجی تھی نہیں، کوئی ایسا اثاثہ بھی نہیں تھا جسے وہ بندوبست کرتے، کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر نظریں چاروں طرف گھما رہی مگر کوئی چیز بھی تو قابل توجہ نہیں تھی پرانا کھٹارہ پیڈل فلین کھڑا اپنی جوالی کے دن یاد کر رہا تھا، لوہے کی چینی اور چینی پر سوار وہ صندوق بھی صرف دیکھنے کی حد تک اپنا احساس رکھتے تھے کپڑا بڑے کی نظر میں تو چند روپوں کے علاوہ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، ایک سینڈ ہینڈلکری کی چھوٹی سی الماری تھی جو چنڈا کی فرمائش پر خریدی گئی تھی جس میں آج بھی اس کی ایف اے کی کتابیں، کالج یونی فارم اور تھوڑے سے انگوٹھی، ہندے رکھے تھے وہ الماری کھول کے کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ان کا

ایران تھا اور چنڈا کی خواہش تھی کہ وہ ایسے کمرے، ایم اے کے کمرے مگر حارہ آپا نے ایک نہیں سنی تھی، ان کا مسود جون ہی سرکاری ہسپتال میں لیپ انٹینڈنٹ ملازم ہوا تو حارہ نے شادی کی ٹھان لی اور پھر وہ بے بس کر دیے گئے، حارہ آپا نے بڑی بہن ہونے کا پورا پورا حق استعمال کیا اور ان کی ایک نہ چلنے دی، چنڈا کی بیگلی آنکھیں دیکھ کر وہ دل بکڑ کے رہ گئے تھے، بڑے حوصلے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے پیارے چمکی دی۔

”بیٹا! تیرے بپا کے کندھے شاید کم زور ہو گئے ہیں۔“ وہ یہ سن کر خاموش ہو گئی اور ان کے کندھوں کا بوجھ کم کرنے کے بجائے مزید بوجھا گئی۔

لاڈلی کے ساتھ ساتھ حارہ آپا کی چھوٹی بڑی فرمائشی اشیا کی لسٹ پہاڑ کی طرح ان کے کندھوں پر آگئی، نور جہاں اس وقت بھی دے دے لیجے میں شاکی تھی۔

”سنگی پھوپھو سے کچھ بھی تو چھپا ہوا نہیں ہے پھر بھی وہ اتنی فرمائش کیوں کر رہی ہیں؟“ یہ سن کر وہ بیوی کے سامنے شرم سا ضرور ہونے لگے مگر پھر بڑے حوصلے سے یہ کہہ کر بیوی کو چپ کرادیا۔

”میں اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے سب کچھ کروں گا مجھے اس کی پھوپھو سے کوئی مطلب نہیں۔“ اور پھر بیچ بچ انہوں نے سب کچھ حسب استطاعت دیا محضے سے ریٹائرمنٹ کی، واجبات سے دھوم دھام سے شادی کی، سب کچھ لگا کر خالی ہاتھ رہ گئے، زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے معمولی سی رقم اور میزگر میں حاصل کردہ گولڈ میڈل بیچ کر جینٹک میں پرچون کا سامان ڈالا تھا۔ پھر بھلا گھر میں کیا رہ گیا تھا لائق فروخت! وہ الماری بند کر کے دوبارہ اپنی چادر پائی پر لیٹ گئے۔

اگلی صبح سحری کھا کے، روزے کی نیت کر کے انہوں نے ٹوبلی اٹھائی اور نماز کے لیے چلے گئے، نور جہاں نے برتن دھوئے سب چیزیں میٹیں اور وضو کر کے نماز پڑھی، قرآن پاک کی تلاوت کی، صبح کے سات بج گئے مگر نور جہاں گھر نہیں آئے تو نور جہاں کو کنگر لاقح ہوئی، دروازے کی جھری سے رستہ دیکھنے لگی مگر ان کا کہیں پاس نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں بیچے ختم ہوئی جب وہ بیڑی زدہ ہونٹوں کے ساتھ گھر آئے اور آتے ہی لیٹ گئے۔

”کیا مسئلہ ہو گیا ہے، روزے کے ساتھ کہاں پھر رہے تھے؟“ نور جہاں نے پابنتی میں چادر تہہ کر کے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”کہیں نہیں! دوست کے پاس گیا تھا۔“ خشک ہونٹوں پر زبان بھیجتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

”سحری کھا تے ہی دوست سے ملنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟“

”نور جہاں! ایک عام عورت کی طرح جرح نہ کیا کر بس تھی ضرورت۔“ وہ چڑ گئے۔

”اس طرح کے سرفی کے ڈبے جیسے گھر میں عام عورت ہی رہ سکتی ہے، جوائی بیت

گئی ان مزی تزی کڑیوں کو دیکھتے دیکھتے، نہ ان کا مقدر بدلا اور نہ میرا!.....“ نور جہاں نے لفظوں پر تو زور دیا مگر لہجہ دھیمہ ہی رکھا۔ نور جہاں اس پر مٹی تاؤ کھا گئے۔

”تو ڈھونڈ لیا ہوتا کوئی محل والا۔“

”اب اس عمر میں یہی بات سنیں ہیں مجھے؟“ وہ رونے لگیں۔

”تو پھر چپ کر امات آتے جاتے کر یہ مل لگا کر۔“

”تمہیں دودن سے پریشان دیکھ رہی ہوں، کچھ نہ پوچھوں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہ پوچھا کیوں کہ تیرے پوچھنے سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔“

”ہم تو شاید مل بھی ہو جائے۔“ اس نے کہا تو وہ تمخرانہ انداز میں مسکرائے۔

”آج دوسرا روزہ ہے، تیری بیٹی کی پہلی عید سے یاد ہے یا؟“ انہوں نے ایسے

پوچھا جیسے عید بھی پہلی ہو اور وہ خود بھی دنیا کی پہلی ماں ہو جسے کچھ بھی پتا نہ ہو، تو خود دل میں

مکمل منصوبہ بندی کر کے بیٹھی تھی، مکمل سچے جنس کے گھر بہت سی دکانوں اور اسٹوروں کے لیے

سوئی میڈ سے تیار کردہ موٹی سویاں تھیں ان سے ناہ رمضان شروع ہونے سے ہفتہ پہلے

دو کلو سویاں تیار رکھنے کا آرڈر دے دیا تھا تاہی چینی اور کھی دال ان کو ہی کہنے والی تھی اس کے علاوہ

وہ ہندی، چڑیاں خریدی تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس بات کے لیے وہ پریشان ہیں۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ وہ کافی اطمینان سے پولیس تو وہ حیرت

سے بولے۔

”اچھا! اس کا مطلب ہے تمہارے پاس روپیہ جیسا موجود ہے۔“

”اللہ ہماری چندا کی قسمت کا نہیں دے گا جو کئی شرمیج کے ضرور بھیجیں گے۔“

”نور جہاں! تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تو کونوں کے عہد میں زندہ ہے ابایلوں کے

زمانے میں نہیں، تیرے کھی شکر سے عید کی مکمل ہو جائے گی کیا؟“ انہوں نے تاسف بھری

نگاہوں سے نور جہاں کے سادہ سے وجود کو دیکھا اور کھڑے ہوئے۔

”نہیں تو کیا مطلب ہے تمہارا۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھے خاصے پیسے چائیں، ہمارے حالات خستہ ہیں دکان پر مشکل سے پچاس

روپے نکلتے ہیں، پشٹن میں گیس، بجلی کا خرچہ بے شکل نکلتا ہے، کوئی رات کو تو کڑی مل جائے اس

لیے ملک خورشید کے ششی کے پاس گیا تھا اس سے اچھی سلام دعا ہے۔ اس نے ملک صاحب کی

بہن سے ملوایا ہے دیکھو کیا بنتا ہے، ملک صاحب زندہ ہوتے تو اور بات تھی۔“ وہ بولے۔

”ہم تو کھی پو پو کے گھر بیٹی بیہ کے بچہ تیار رہے ہیں جبکہ کے نام پر سب کچھ دیا،

عید تو فسی خوش کا ایک بہانا ہے عید کی حقیقت ہی کیا ہے؟ تم صاف کہہ دو جو اللہ دے گا بیج

دیں گے، ہمیں سولی پر نہ لٹائیں۔“ نور جہاں خاصی جذباتی ہو گئیں، مگر نور عمر نے کبھی اس

طرح کے مشورے کو کھٹ نہ کیا تھی، وہ کبھی اسے نظر انداز کر کے دکان کھولنے چل دیے جب

کہ نور جہاں غم دھسے سے کھولتی ہوئی گھر کی مٹھائی میں مصروف ہو گئیں۔

نور عمر کا خیال درست تھا حارہہ آپا نے مسایوں کے ہاں فون کر کے نور جہاں کو

عید کے زمرے میں خاصی لمبی چوڑی فہرست سنا دی، جس کی رو سے چندا، مسودہ، حارہہ، آپا،

شبانہ، فرزانہ اور چھوٹے مسودہ کے جوڑے، چڑیاں، جوئے، چاول، سویاں، کھی، شکر اور میوہ

بھیجتا ہے۔ مٹھائی کے نقد پیسے پتا کھڑا، برادری میں مٹھائی بھیجی جاسکے۔ نور جہاں دم سادھے

سختی رہیں، فون بند ہو گیا وہ بدحواس سی گھر آئیں، نور عمر دکان سے اٹھ کر عصر کی نماز پڑھنے

گئے تھے اس نے کھوئے کھوئے انداز میں دال کینے کے لیے رکھی، تھوڑے سے تین کا سالٹ

پکڑوں کے لیے تیار کیا، آٹا گوندھ اور چولھے کی آگ کو کچھ لگنے لگی۔ کافی دیر دینا سے بے خبر وہ

سرتھارے دال کی دہنچی کے نیچے جلتی آگ دیکھتی رہیں، ہوش اس وقت آیا جب دال جلتے کی

خت بوتنتوں میں کھی، دہنچی کے نیچے چولھا بند کیا جلدی سے بنا کپڑے کے ڈھکنا اتارنے کی

کوشش میں اٹھ چلا یا چاروں انگلیاں جل گئیں، تکلیف سے آنکھیں پھرائیں، دال کی دہنچی

کالی پر گئی تھی، مغرب کا وقت قریب آ گیا تھا جلدی سے کڑا ہی چولھے پر رکھی، پکڑے تلنے

شروع کیے کہ نور عمر نے گھر کے اندر سے دکان کا دروازہ بند کر کے زور سے کہا۔

”مسجد جارہوں۔“ اس نے اطمینان سے سانس لی، اس وقت وہ نور عمر کو پریشان

کرنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ اڑتالیس سالہ نور عمر بیٹی کی شادی کے بعد کڑا کڑ اور غر حال نظر

آنے لگے تھے، نور جہاں کو اپنے سہاگ کی سلامتی بھی عزیز تھی اس لیے اس نے رات عشا کی

نماز اور تواج پڑھنے کے بعد بھی ان کے گھر نہ آنے پر کوئی پریشانی محسوس نہیں کی، رات کے

بارہ بج رہے تھے جب وہ گھر آئے۔۔۔۔۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر بستر پر

لیٹ گئے۔

وہ بھی لیٹ گئی تو نور عمر نے خاموشی کو توڑا۔

”میں بنائے والوں نے انسان کو رسوں کا غلام بنادیا۔“

”تمہاری تو اپنی بہن ظالم ہے وہ ایسے فرمائش کرتی ہیں جیسے بھائی کی ٹیکریاں

چل رہی ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ چندا کو اندھے کنوئیں میں پھینک دیجئے۔“ شام سے اس وقت تک دل میں جو مواد کھول رہا تھا وہ نور جہاں نے پھینکار کے باہر نکال دیا۔

”خبردار! میری چندا کے لیے ایسا بات پھر نہ کہنا، کیا تم نہیں جانتیں اس میں میری جان ہے، وہ کسی گھر بھی جاتی ایسا ہی ہوتا، زمانے کی آنکھ پتھر کی ہو چکی ہے، ویسے بھی یہ اتنی بڑی بات ہے جسے مفلسوں کے لیے بن گئی ہے ورنہ پیسے والوں کے ہاں کیا مسئلہ؟“ وہ گرجے گرجے ایک دم غصے سے پڑ گئے۔

”اس کا مطلب ہے تمہاری بہن تمہیں بڑا آدمی سمجھتی ہے۔“ وہ جل کر بولیں۔
 ”بھئیے، وہ اللہ مالک ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر کرو بندوبست، ہزاروں روپوں کا خرچا ہے چلتے کڑھتے رہو۔“ وہ کہہ کر آٹھ گھنٹے سونے کے سوتی بن گئیں۔ نور محمد نے کچھ رنجیدہ خاطر ہو کر بیوی کو دیکھا اور سوچا۔
 ”کہتی تو تم بچ ہو مجھے احساس ہے مگر خود ہی سوچو چندا میرے لیے کیا ہے؟ میں نے تو بچپن سے لے کر بڑے ہوئے تک اس کے ہر چوم کر مات کا آغاز اور دن کی ابتدا کی۔ مجھے میری بیٹی کتنی عزیز ہے یہ تم جانتی ہو، شاید بڑی آپا کو بھی یہی معلوم ہے اس کی وجہ سے وہ مجھ سے اس کی محبت کا خراج مانگتی ہیں، میں اپنی چندا کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔“ وہ بڑی دیر چار پائی سے پاؤں لٹکا کر نور جہاں کی خاموشی کو سنا رہے۔ وہ سوچنے لگی تھیں جب کہ عری کے وقت انہوں نے ناٹم نہیں کے الارام کا کام کیا۔ ساری رات ان کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھ کر نور جہاں نے فقط ان کو احساس دلانے کے لیے کہا۔

”چندا میری بھی بیٹی ہے چھوٹے سے مسئلے کے لیے یوں کڑھتے رہے تو کیا بنے گا۔“
 اللہ پر بھروسہ رکھو جو دے گا ہم بھیج دیں گے مگر تم نے۔“ انہوں نے اس کا جملہ درمیان سے اچک کر خیرگی سے کہا۔
 ”کیا جانتی ہے تو! میری بچی چولہا پھینٹنے سے جل مرے، اس پر تیزاب ڈال دیا جائے۔“

”خدا نہ کرے، تم نے زیادہ فضول سوچنا شروع کر دیا ہے۔“ چولہا جلاتے ہوئے وہ کانپ اٹھی۔

”میں چپ رہوں، تم عورت ہو کر عورت کی فطرت سے ناواقف ہو۔“ یہ کہہ کر وہ وضو کرنے کے لیے لیکن میں گئی کوئی کی طرف چلے گئے۔

بات تو نور جہاں کی بھی دل کو لگتی تھی، عید کی بھیجے کے لیے وہ جس قدر پریشان اور فکر مند تھے اس سے ایسا لگتا تھا جیسے بنی بیابانے کی گھر ہو، عید کی معاشرے کی رسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی مگر نور محمد جانے کیوں اس قدر اس مسئلے کو اہمیت دے رہے تھے، دکان پر بیٹھتے پھر جانے کہاں جاتے کدو سے رات ہو جاتی۔ ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی، روزے کی حالت میں مارے مارے پھرنے سے بہت کمزور اور غمگین ہو گئے تھے نور جہاں دل ہی دل میں دیکھتی ہوئی مگر پوچھتی نہیں کیوں کہ پوچھنے پر صرف ڈانٹ پڑتی، جھگڑا ہوتا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ روزے کے ساتھ کتنی پوٹھلا بالکل خاموش تھیں۔ دن پر لگا کر اڑ رہے تھے، رمضان کا دوسرا عشرہ بھی ختم ہونے کو تھا جب کہ ابھی تک کوئی چیز چندا کے لیے نہیں خریدی تھی کتنی جی نے سویاں بھیجیں تو اس نے پیسے دکان پر بیٹھے نور محمد سے مانگتے چاہے مگر دکان بند تھی۔ اسے جتن بی سے معذرت کرنی پڑی کہ پیسے شام کو پہنچا دوں گی۔

”کیا بات ہے، بھائی نور محمد دکان ختم کر رہے ہیں کیا کوئی سودا نہیں ملتا، دکان بھی بند رہتی ہے؟“ جتن بھی جہاں دیدہ خاتون تھیں گھر کی خستہ عالی کونٹوں میں مہیاپ کر بولیں۔
 ”مال جیبوں سے آتا ہے، چندا کے لپا کوئی نوکری کرنے کا سوچ رہے ہیں۔“ اس نے خفت سے کہا تو جتن نے بے لڑک آواز میں اسے نور محمد کے بڑھاپے کا احساس دلایا۔

”اس عمر میں کیا نوکری کرے گا نور محمد، اللہ جیادے دیتا تو آرام سے بڑھاپا گزر جاتا۔“
 نور جہاں نے انہات میں گردن ہلائی اور خاموشی اختیار کی، دن بھر جتن بی کی باتوں پر غور کرتی رہی کہ کیا کیا جائے بات چندا کے خرچے سے آگے کی تھی اب تو گھر میں چولہا بھی جتنا حال ہوتا جا رہا تھا، اس نے اندر سے دکان کا دروازہ کھول کے جائزہ لیا تو بج بج دکان خالی تھی۔ چند ایک تھوڑی تھوڑی چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دیکھی ہو کہ اس نے دروازہ بند کیا اور کمرے میں آ گئی۔

رات گئے نور محمد آئے تو اس کے کچھ کہنے سننے سے پہلے انہوں نے پانچ ہزار روپے اس کی طرف بڑھائے، اسے برقی روٹی چھوٹکی، ایک طویل عرصے سے روپوں کی اور اسے روپوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ بتا کچھ بولے بستر پر لیٹ گئے۔ ان کے چہرے

پر جامد سنا تھا آنکھوں میں بھیجے بھیجے سے جگمگو تھے۔ نور جہاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے پہنچے کہاں سے آئے؟ اس کے تشویشی انداز پر انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔
 ”چندرا کے لیے جو کچھ جارہہ آ پانے کہا ہے بنانا شروع کر دو، پیسے اور آ جائیں گے۔“
 نور جہاں کو واضح محسوس ہوا کہ وہ خوش نہیں ہیں حالانکہ چندرا کے حوالے سے تو انہیں خوش ہو کر یہ بات کرنی چاہیے تھی، وہ اٹھ کر ان کی پانچٹی میں آ بیٹھی۔

”اگر ان پیسوں سے دکان کے لیے مال خرید لو تو۔۔۔“

”جو کہا ہے وہی کرو، دکان ختم ہو گئی نور محمد کے ساتھ ساتھ۔۔۔“ انہوں نے کچھ غصے اور کچھ غم کے ساتھ کہا اور آنکھوں پر دایاں ہاتھ رکھ کر چپ ہو گئے۔
 ”اس عمر میں نوکری تم سے نہیں ہوگی، ہمارے لیے تو دکان اور پشٹن بھی کافی ہے۔“
 نور جہاں نے ایک باہر پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”بے وقوف عورت! ہر عمر کی اپنی آزمائش ہوتی ہے مختلف صورتوں میں مزدوری ہر عمر میں کرنی پڑتی ہے۔“

نور جہاں کے پلے کچھ نہ پڑا، وہ پانچ ہزار کا بوجھ بٹیکے کے نیچے رکھ کے خود فنی بوجھ میں مبتلا ہو گئی۔ ہزار سوال ذہن میں بٹیکے بٹیکے سے مل چل چارے تھے مگر انہیں ذہن سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی کہ ایک دم موبائل کی آواز پر بڑ بڑا کے اٹھ بیٹھی، اس کے ساتھ ہی نور محمد بھی جلدی سے قمیض کی بٹنی بٹنوں نے لگے جوں ہی موبائل فون نکال کر انہوں نے کان سے لگایا تو وہ حیرانی سے منہ کھولے بیٹھ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئے کچھ دیر بعد واپس آئے تو اس کے سمجھنا نہ سنے سے پہلے گویا ہوئے۔

”یہ موبائل فون ہے، آج ہی لیا ہے۔“ اس اطلاع سے زیادہ ضروری بات وہ نظر انداز کر گئے اس کو اس طرح بتایا گیا جیسے وہ غار کے زمانے کی باشندہ ہے جو بات بتانے کی ضرورت تھی وہ بتانے پنا وہ چندہ موڑ کے سو گئے نور جہاں کی آنکھیں صاف ہو گئیں، نیند سے تو گویا شامانی ہی نہیں تھی مسلسل نور محمد کی پشت کو کھور رہی تھی انہیں شاید احساس ہو گیا جو کر دٹ لے کر اس کی بے خواب آنکھوں میں دیکھا جہاں دور دور تک اٹھائیس سالہ گزرے رفاقت کے لمحات دکھائی دے رہے تھے انہوں نے اس سوال کے خود ہی کہا شروع کیا۔

”میرے ابا کی شدید خواہش تھی کہ میں میٹرک کے امتحان میں اولی پوزیشن حاصل

کردی، میری ماں، ابا کی خواہش پر دل کے گوشے گوشے سے دعا کے الفاظ کشید کر لاتی اور کہتی۔
 ”فیض محمد! نور محمد بہت سختی پیچھے رہے گا تیری خواہش پوری ہوگی، ابا اور اماں کی باتیں سن کر چھوٹے سے تنگ تار یک کرے میں بیٹھا اور زیادہ ہمت سے محنت کرتا، ابا نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر میرے لیے آتائیں جمع کر دی تھیں، ہر شام ڈیوٹی پر جانے سے پہلے میرا ہاتھ پدم کر بھیجیں آنکھوں سے کہتا۔

”اؤں نور محمد! فیض محمد سے اب مال گودام کی چوکیداری نہیں ہوتی، ہڈیاں جھنڈے لگی ہیں تو اتنی محنت کر کے تیرے ابا کے آرام کے دن آ جائیں، راتوں کو جاگ جاگ کر جوانی سے بڑھا پآ گیا اگر ہم بھی بڑھ لکھ لیتے تو گودام کے مالک ہوتے۔“

ابا کی باتیں میری رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتیں، میں کتاب کھولنے سے پہلے ابا کے لیے سوچتا، آنکھ کھولنے سے اب تک انہیں چوکیداری کرتی ہی دیکھا تھا۔ تھوڑی سی تنخواہ میں صبر شکر کے ساتھ گزر بسر کرتے پایا تھا اور پھر میں کھڑکی سے باہر جھن میں دیکھتا تو میری ماں بیٹھی پھاڑی کی چھالید کرتی رہی ہوتی، ہنستے بھر چھالید کرتے کے بعد جو دس بیس روپے ملتے اس سے میرے لیے کھوپرے کا تیل، بادام کی گری لے آتی، بڑی چاہ سے سر میں کھوپرے کے تیل کی مالش کرتی اور کہتی جاتی۔

”بڑھ پڑھ کر میرے لال کا سر خشک ہو گیا کھوپرے کے تیل سے دماغ تر ہو جائے گا۔“ اپنی طرف سے وہ ماہر طبیب بن کر کہتی حالانکہ دماغ کو کسی کھوپرے کے تیل سے تر ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر اس کی ممتا بھری انگلیوں کا لمس میرے سر میں ایسے اثر تا کنوڑ طاری ہو جاتا تھا کہ اس کی گود میں سر رکھ کے سو جاتا، تو ماں کو پکا یقین آ جاتا کہ یہ کھوپرے کے تیل کا کام ہے جو نیند آگئی رات سونے سے پہلے بادام کی گری چھیل کر دودھ کے پیالے کے ساتھ دیتی، اس کا بادام کی گری دودھ کے ساتھ کھانے کے حوالے سے بھی اپنا ہی نقطہ نظر تھا کہ جو کچھ پڑھا ہے وہ ذہن میں محفوظ رہے گا، وہ دونوں اپنی صحت، آرام کا خزانہ مجھ پر لٹاتے رہے، میری ماں کے ہاتھوں میں سخت گریں پڑ گئی تھیں، لکی بار سروتے سے انگلیاں کٹ جاتیں مگر وہ کپڑے کی کٹرن لپٹ کر پھر سروتا اٹھ لیتی۔ میں دونوں سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے ان کی قربانیوں کا بدلہ چکانے کے لیے میٹرک کے امتحان کی ایسی تیاری کی کہ کچھ میری اول پوزیشن آگئی مجھے بورڈ کی طرف سے گولڈ میڈل ملا۔ اخبارات میں میری اور ابا کی فوٹو

بچھی وہ بہت خوش ہوئے، لہذا بانٹنے مگر یہ خوشی زیادہ دن وہ برداشت نہ کر سکے۔

”نور جہاں! وہ اہراموں اور محبوس سے ملا ہوا میڈل میں نے دکان میں مال ڈالنے کے لیے جس روز بیچا تھا اس دن کیل کا دانا بھی میرے منہ میں نہیں جاسکا تھا میں بھوت بھوت کے رویا قسام سے چھپ کر، شاید اپنے آپ سے گھٹل کر، میں نے اپنے ماں باپ کے ارمان بیچے تھے، غربت میں، خواہشات کی کڑی قید میں قدم قدم پر کم زور لمبے آتے ہیں اور ہم انسان ہیں فرشتے نہیں۔“ انہوں نے اتنی قوی کھول کہاں کی بنا کر آخری جملے کی تائید چاہی، مگر نور جہاں کی آنکھیں تو خود برس رہی تھیں اسے گولڈ میڈل کی یاد اس گھڑی شدت سے آئی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر وہ مضطرب سے انداز میں اٹھ کر کمرے سے ہی نہیں بلکہ گھر سے باہر چلے گئے۔ دو دن نور جہاں چندا کی عیدی کے لیے خریداری میں مصروف رہی، نور محمد نے پانچ ہزار کے بعد دوسرے دن صبح گھر سے جاتے ہوئے اس کے ٹکے پر اور پانچ ہزار رکھے تو وہ پھر ان کو حیرت سے دیکھنے لگی، وہ باہر نکلتے ہوئے دھیرے سے کہہ گئے۔

”اپنا خون جگر جلا کر تو خوشی منانے کا حق ہے سب کچھ خریدو۔“ وہ تو کہہ کر چلے گئے لیکن وہ سر قسام کے بیٹے گئیں نور محمد کی شخصیت پر اسرار لگنے لگی تھی جانے وہ کیا کر رہے تھے نہ آنے کا پتا تھا اور نہ جانے کا! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سر پر کون سا جنون طاری ہو گیا۔ چندا کو فون پر ان کی حالت بتائی تو وہ پریشان ہو گئی۔ رونے لگی، اپنے آپ کو انضمام دینے لگی، اسے مشکل سے تسلی تھی دے کر چپ کرایا۔ نور جہاں نے تقریباً سب چیزیں خرید لی تھیں سوائے چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے، وہ شام افطاری کے لیے بھجوریں دھو رہی تھی کہ نور محمد پھل اور پکڑے سموسے لیے آ گئے اس کی طرف تھیلے بڑھائے تو وہ چند لمبے ہاتھ آگے نہ بڑھا سکی، انہوں نے خود ہی چار پائی پر تھیلے رکھ دیے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مو بائل فون بچنے لگا، انہوں نے فون کی اسکرین پر نمبر دیکھا اور پھر فون بند کر کے اس کی طرف بھیجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے دوستوں کے ساتھ روزہ افطار کرنا ہے شاید دیر سے آؤں۔“ وہ اس کا جواب سننے بغیر ہی تیز قدموں سے باہر چلے گئے نور جہاں نے مردہ قدموں سے چل کر دروازہ بند کیا اور واپس اس چار پائی تک آ گئیں جس پر نور محمد کے رکھے تھیلے اس کے ہاتھ لٹنے سے منتشر تھے مگر اس کا دل ہی نہ چاہا، اذنان کی آواز پر پہلے سے موجود بھجور سے روزہ افطار کیا اور وضو کر کے نماز

پڑھتے لگی، رات گئے نور محمد آئے تو دونوں تھیلے اسی حالت میں رکھے دیکھ کر کھنچلا سے گئے۔

”نور جہاں تنگ! انہیں لانے کے لیے تمہیں نہیں معلوم میں نے کس دشوار راستے پر سفر کیا ہے اور تم نے کھول کر بھی نہیں دیکھا۔“ انہوں نے چار پائی پر رکھے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ نور جہاں نے سلائی مشین چلاتے چلاتے رک کر جواب دیا۔

”میں نے تو نہیں کہا کہ تم مشکل راستے پر چلو۔“ مختصر مگر چپے ہوئے سوال پر وہ مزید تندہ لہجے میں بولے۔

”ضرورت کی اپنی زبان ہوتی ہے مگر تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

”چمکا کے لاپا! پہلے تو میں تمہاری ہر بات سمجھ لیتی تھی مگر اب واقعی میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم کس راستے پر چل رہے ہو۔“ کمزور ہاتھ کی طاقت سے مشین کا پیپر کھاتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ چپ چاپ سپر اتار کے چار پائی پر لٹ گئے نور جہاں نے انہیں دیکھا اور زور سے بولی۔

”بیبی کی خاطر کہیں خود سے الگ نہ ہو جانا۔“ نور جہاں کا لہجہ بظاہر نارمل تھا مگر اس میں ہرنی کے حلق سے نکلنے والی دروہری چیخ کا اثر تھا، وہ کروٹ بدلتے پر مجبور ہو گئے اور اس کڑے سچ سے پورے وجود پر کڑواہٹ سی طاری ہو گئی۔

چند دن اور گزر گئے ماہ رمضان کے آخری عشرے کے ایک دن گزرنے کے بعد نور محمد نے اس سے تیاری کی بات پوچھا۔ اس نے تیاری مکمل ہونے کا بتایا تو انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کل کی سیٹ بک کرا آتا ہوں، عید کر کے آ جانا۔“

اور تم؟“ نور جہاں نے حیرت سے پوچھا۔

”اور تم کیا؟“ انہوں نے بھی یہی سوال کر دیا۔

”تم نہیں جاؤ گے کیا؟“

”نہیں! یہاں کام ہے فارغ نہیں ہوں۔“ وہ دل میں سر اٹھاتی چندا کی یاد، دباتے ہوئے۔

”کیا کام ہے؟ عید کر کے آ جائیں گے چار دن کی تو بات ہے۔“ نور جہاں نے دھیرے سے کہا۔

”کہہ دیا کہ نہیں جاسکتا، تم تیاری مکمل کرو میں ابھی سیٹ بک کر کے آتا ہوں۔“

کرنے لگیں بات آئی گئی ہوگئی بس نور جہاں کو یہ یقین ہو گیا کہ نور محمد کی پریشانی میں مبتلا ہیں اسے ان سے ہمدردی سی ہوئی مگر کچھ پوچھنے کی مہلت نہیں ملی، دل میں بار بار ہوک اُٹھتی کہ کون سی انجمن ہے مگر پوچھتی تو جب وہ مگر میں ہوتے، اس نے ان کے انتظار میں سب کام نہ بنائے ان کے کپڑے بھی استری کر دیے، جوتا بھی پالش کر دیا اپنی بھی تقریباً سب تیار ہی مکمل کر لی۔ گھن میں، برآمدے میں رکھی سب چیزیں کرے میں بند کویں وہ نمیک ساڑھے نو بجے رکشا ساتھ لے کر گھر آئے۔ وہ جلدی سے چادر اوڑھ کر گھن میں آ گئی۔ انہوں نے سامان اٹھا کر رکشے میں رکھا، وہ تالا لے آئی تو انہوں نے تالا لگا کر چابی ان کی طرف بڑھائی اور یاد دہانی کے لیے بولیں۔

”چابی اپنے پاس رکھو۔“

”نہیں! یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔“ انہوں نے رکشے میں ان کے برابر بیٹھے ہوئے کہا وہ کچھ نہ سمجھی۔

”اور تم کیا کرو گے؟“ رکشا چلتے ہی نور جہاں نے پوچھا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، کام کے لیے شاید مصروف رہوں۔“ وہ باہر سڑک پر دیکھتے ہوئے بولے تو ہمیشہ کی طرح وہ چپ ہوگئی، چابی اپنی گھن میں دبے خود بھی باہر دیکھنے لگی جب کہ وہ چور نظروں سے اس کے چہرے کی سادگی کو دیکھ کر ہونٹ کاٹنے رہے۔ ایک دم ہی نور جہاں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرایں وہ سخت سے خود بھی مسکرانے کی کوشش کرنے لگے۔۔۔۔۔۔ انیشین سے باہر رکنے سے آخر کر سامان اتار کے فارغ ہوئے تو وہ بولیں۔

”جہاں بھی رہنا یا خیال رکھنا اور چندا کی فکر نہ کرنا اسے میں سمجھا دو گی۔“

”اسے کہنا اس کے ابا کو اس کی خوشی چاہیے اسے جو چاہیے وہ بتا دیا کرے۔“ بیٹی کے تذکرے پر ان کا گلا رندہ ہو گیا تو جلدی سے سامان اٹھا کر انیشین کے بڑے داخلی دروازے کی طرف چل دیے وہ بھی ان کے پیچھے جھوٹا سا بیک اٹھا کر چلے گئیں۔ انیشین کی بھیم بھاڑ میں، بے ہنگم شور و غل میں دونوں کے دل اداسی سے بھر گئے، نور جہاں کی زندگی کا پہلا تہمتا سفر تھا وہ اس حالت میں کہ نور محمد کی طرف سے عجیب سی پریشانی کا شکار تھیں بیٹی کے لیے عید دی لے جانے، اس کے ساتھ عید منانے کی خوشی بھی سمجھی تھی بہت سے اندیشے تھے، بہت سے دوسرے تھے جو دل میں لیے جاری تھیں، گاڑی جانے کے لیے بالکل تیار تھی، نور محمد نے مطلوبہ

ہوگی نمبر دیکھ کر اس میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سوار ہوگئی، کافی رش تھا نور محمد نے اسے ایک علیحدہ سیٹ پر بٹھا کر سامان رکھنے کی جگہ بتائی۔

سامان رکھ کے کچھ دیر کو ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے سامان کا دھیان رکھنے کو کہا، یہ بھی بتایا کہ مسعود کو کون کر دیا ہے وہ انیشین پر لینے آ جائے گا ان کی آنکھیں بھیگ گئیں سب باتیں سن کر انہیں میں گردن ہلا دی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر سامنے والی سیٹ کا حق دار مسافر آ چکا تھا۔ نور محمد اس کے آتے ہی گاڑی سے نیچے اتر کے باہر سے اس کمر کی طرف آ گئے جہاں نور جہاں بیٹھی تھیں مسلسل بھیگ لگا ہوں سے ان کے چہرے پر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بہت بے بس اور مجبور لگ رہے تھے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر نہ یہاں موقع تھا نہ وقت! گاڑی کی روانگی کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے خدا حافظ کہتے ہوئے ہاتھ ہلایا تو وہ خود جلدی سے بولیں۔

”چھپا کے ابا سنو! یہ چابی رکھ لو، تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔۔۔۔۔۔ جہاز کے دونوں ٹکٹ تمہارے ٹیکے کے نیچے ہی رکھے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھیں مگر جذبات غالب آ گئے، آواز بھرا گئی کچھ اور نہ کہہ سکیں گاڑی ریٹکے لگی تو وہ سکتے میں آ گئے۔ اتنا اچانک انکشاف، بتانا تو وہ سب کچھ کہ گئیں، لڑتے ہاتھوں سے وہ چابی دینے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ہاتھ آ گئے نہ پوچھا سکا، بس جرم ثابت ہونے والے مجرم کی طرح گردن جھکانے لگے۔

پھر انہوں نے ان کے قدموں کی طرف چابی اچھال دی گاڑی کی رفتار میں تیزی آ چکی تھی۔ وہ ساکت سے کمرے نظروں سے اوجھل ہوتی گاڑی کو دیکھتے رہے اور پھر احساس ندامت کے ساتھ جبکہ کر چابی اٹھائی۔



کمال نہیں تو وہ ایسے چپ کر کے ان دونوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی جیسے اس کا وجود وہاں تھا ہی نہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کو ستاتے۔ آخر میں ناصر الدین سکرا کر کہتے۔

”ارے بھگوان! کیوں دل جلاتی ہو، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، دسویں کرنے میں بھی پورے سال کا عمر گئے گا۔“

”ارے پوت کے پاؤں پالنے میں ہی دکھائی دے جاتے ہیں، جانے کیا دن دکھائے گی چندا بی۔“ صالحہ خاتون کہہ کر اپنے کام سے لگ جاتیں۔

آج تو وہ نہیں چاہتی تھیں کبج مگر میں آواز بلند ہو، سادہ سی گھر بیلا صالحہ خاتون صرف نام کی صالحہ نہیں تھیں عملاً بھی انتہائی نیک پارسا خاتون تھیں۔ کلرک شوہر کی قلیل آمدنی میں بڑی بچہ داری اور کفایت سے گھر چلا رہی تھیں۔ ناصر الدین دل و جان سے ان کی قدر کرتے تھے کیوں کہ انہوں نے کبھی شوہر کو کسی قسم کی جتنی اور پریشانی نہیں دی تھی، ہر دکھ کسم کسم کچھ نہ کچھ پس انداز کیے ہوئے روپے چپکے سے شوہر کی منشی میں بند کر دیتیں۔ ناصر الدین کی ٹھکرات سے جان چھوٹ جاتی۔

دونوں کو اللہ نے چندا کی صورت میں ایک بیٹی ہی عطا کی تھی۔ نہ چندا ہے پہلے کوئی اولاد ہوئی اور نہ چندا کے بعد! شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت لاڈلی تھی خاص کر ناصر الدین کی تو اس میں جان تھی جب کہ صالحہ خاتون کا رویہ بیٹی کے ساتھ مصلحت پسند ماں جیسا تھا۔ وہ اس سے پیار بھی کرتی تھیں اور سرزنش بھی کرتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ اس کی اچھی تربیت ہو، اسے ملیت شعار، مہذب اور شائستہ لب و لہجہ والی بنائی جائے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر داری کے طور پر پتے، دابھے آداب زندگی سکھا نہیں۔ مگر ان کی ذرا سی بھی محنت کا اس پر اثر نہیں ہوا تھا وہ فطرت کے عین مطابق لا پرواہ، لا ابالی، کلنڈر سی تھی۔ مزے لے لے کر اچار کھاتا، گھنٹوں آم کے اچار سے مٹھلی والی پھانک نکال کر چوٹا، تیل سے بھری انگلیاں قیس کا دامن الٹ کر صاف کر لیتا براٹھے اور کھجی والی روٹی کو روشت سے کھاتے ہوئے دو پٹا اور کپڑے سب پکینے کر لیتا! یہ وہ عادات تھیں جو ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں جس پر اسے اماں سے ڈانٹ پڑتی تھی اور بابا سے پیار بھری جھڑپ۔

اسے سکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری ناصر الدین صاحب کی تھی، اسکول بہت دور نہیں تھا مگر قربت جی بھی نہیں تھا۔ سائیکل پر پندرہ سولہ ٹنٹ لگ جاتے تھے ویسے

اور بس

اسٹبل کی کٹوری سے اچھی طرح دہی چاٹ کر ابھی کوچے سے ہوئے پوری پوری طمانیت کے ساتھ اپنا پسندیدہ ناشتا کرنے کے بعد وہ باورچی خانے میں رکھی کٹوری کی بیڑی سے ابھی تو یہ دیکھتا ہی تھا کہ اسٹری شدہ یونی فارم کی حالت ہی بدل گئی ہے۔ بے پناہ شکستیں اور جا بجا پراٹھے کی چکانی اور چینی والی دہی کے قطرے سے جم گئے تھے۔ مگر نہ اس نے پہلے کبھی اس بات پر دھیان دیا تھا نہ آج دیا۔ صالحہ خاتون نے گھور کے اسے دیکھا تو وہ ان جان کی بولی۔

”کیا دکھ رہی ہو اماں؟“

”جاکچہ نہیں! اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔“ صالحہ خاتون نے بات ڈالتے ہوئے کہا کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ ناصر الدین باہر سائیکل نکالے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے اپنے دفتر کا نام ہو رہا تھا۔ روزی وہ انہیں دیر کرائی تھی جس پر ابھی خاصی جھڑپڑتی مگر اگلے دن وہ پھر دیر سے تیار ہوتی۔

دراصل وہ رات دیر تک ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی اور صبح بار بار ماں کے جگانے پر یہ مشکل تمام اٹھتی اور پھر تیار کی میں بہت سادہ رنگ لگ جاتا۔ ناصر الدین لاڈلی اکوٹی بیٹی کو بہت زیادہ برا بھلا بھی تو نہیں کہنا چاہتے تھے۔ فقط اتنا کہتے۔

”چھو! ابھی تک تعلیم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔“

”اسی نے تعلیم کا بگاڑا ہے، جانے کیسے دسویں میں بھیج گئی، نہ اٹھنے کا ملیت نہ بیٹھنے کی تیز! بچوں سے زیادہ براے طریقے سے کھانا، یونی فارم سے چکانی کے دھبے نہیں مٹنے جانے کب شعور آئے گا؟“ صالحہ خاتون شوہر کی نرمی کو اپنے لہجے کی گرمی میں بدل کر دل کی ہزاس

تو محلے سے کچھ لڑکیاں رکشوں پر..... کچھ پیدل بھی جاتی تھیں مگر وہ ناصر الدین صاحب کی سائیکل پر آتے جاتے ہی دوسری جماعت میں پہنچ گئی تھی۔

مگر چھوڑو سے وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی یہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی ماں باپ دونوں سر جوڑے کسی خاص مسئلے پر بات کرتے نظر آتے اور کبھی اماں کھانا پکانے میں مصروف ہوتیں اور لاپرواہی کے پرانے رنگین ٹی وی کے سامنے آتے انتہاک سے بیٹھنے نہیں دیکھ رہے ہوتے کہ وہ دبے قدموں واپس لوٹ آتی..... لیکن پھر اس نے سوچا کہ پہلے اماں سے بات کرے..... بعد میں اب اسے اماں خود ہی بات کر لیں گی۔

”اماں!“ اس نے ہنسیا بھونکی ہوئی صالحہ خاتون کو پکارا۔

”ہوں! کیا بات ہے۔“ انہوں نے براہِ روڈی چلائے ہوئے پوچھا۔

”اماں! مجھے بہت شرم آتی ہے اب اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور.....“ محلے سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی تو صالحہ خاتون نے حریت سے اسے دیکھا مٹی اور پوچھا مٹی۔

”ہیں! کاہے کی شرم اور یہ بڑے چھوٹے ہونے کی فکر کریں لگ گئی ہے؟“

”اماں! آخر تک میں کب لبا کی سائیکل پر اسکول جاتی رہوں گی؟“ اس نے جلدی سے سوال کر ڈالا تو صالحہ خاتون نے سامان میں غار ڈالتے ہوئے ٹھٹھک کر بھر دیکھا۔

”جب تک اللہ تیرے لبا کو موٹر سائیکل نہیں دیتا۔“

”ہوں! میں میٹرک کروں گی پر.....“ اس نے منہ بسورا تو صالحہ خاتون نے اس کا جملہ اچک لیا۔

”پر دور کچھ نہیں! سائیکل پر کیا کاٹنے نکل آئے ہیں؟“

”سب لڑکیاں میرا ذاتی اڑاتی ہیں زمر، رابعہ، پروین رکشے میں جاتی ہیں۔ مجھے بھی رکشا لگوا دو۔“

”واہ مٹی! آج سائیکل بڑی لگ رہی ہے۔ کل کلرک باپ بڑا لگے گا زمر، رابعہ نے کان بھرے ہیں تمہارے ان کی تو میں ابھی خبر لے کے آئی ہوں۔“ صالحہ خاتون نے ایسے لے لیے کہ وہ گھبرا گئی۔

”ٹھیک ہے اماں! میں پیدل چلی جایا کروں گی محبت اور کوڑ کے ساتھ۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے سبز پتہ چاہئے، کاہے کے ساتھ ہی جاؤ گی۔“ صالحہ

خاتون نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور ہنسیا چولے سے اتار کے روٹی پکانے میں مصروف ہو گئیں، وہ کچھ برتن بسورتی رہی پھر ابی آواز پر ان کے پاس کمرے میں چلی گئی۔

بات آئی مٹی ہو گئی لیکن صالحہ خاتون اپنی جگہ کچھ الجھی گئیں۔ انہیں الجھن کا شکار دیکھ کر ناصر الدین سے کل سے ہو گئے۔ روٹی کا نوالہ بھی پیٹ میں چھوڑ دیا اور سر ہو گئے۔

”صالحہ بیگم! پہلے اپنی الجھن کو، پھر نوالہ مٹل سے اتار دوں گا۔“

تمہاری لاڈلی کو فرمائش کرنا آگئی ہے۔“ صالحہ خاتون نے کہا تو ناصر الدین ہولے سے مسکرائے اور جیب سے بڑا نکال کر جاکھ لینے لگے کہ اس میں کتنے پیسے ہیں جس سے چندا کی خواہش پوری کی جاسکے۔

”چندابی! اب سائیکل پر اسکول جاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں، رکشا لگوانا چاہتی ہیں۔“ صالحہ خاتون نے ان کا مطلب سمجھ کر جلدی سے کہا۔ ناصر الدین نے بڑا دوبارہ جیب میں دکھا اور چپ ہو کر سوچنے لگے۔

”کھانا تو کھاؤ، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ صالحہ خاتون نے کھانے کی طرف توجہ دلائی۔

”ٹھیک ہے، محلے سے دو بچیاں اور رکشے پر جاتی ہیں وہی رکشا لگوا دیتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”اور پیسے کہاں سے آئیں گے؟“ صالحہ خاتون نے ترخ کے کہا۔

”اللہ دے گا۔“ مٹی کی قسمت کا اللہ ہی دے رہا ہے میرا سالانہ انکر سینٹ لگنے والا ہے وہ رکشے والے کو دے دیا کریں گے۔“ ناصر الدین نے حسبِ عادت تحمل سے جواب دیا اور کھانا کھانے لگے۔

”بات پیسوں کی بھی نہیں ہے۔“ صالحہ خاتون کچھ الجھی الجھی تھیں۔

”اور کیا بات ہے؟“

”کل کی بچی کو زبان لگ گئی ہے۔ یہ ابھی بات نہیں۔“

”اور سے چھوڑا! بچی سے سائیکل پر تو چھوٹا سا بچہ بھی بیٹھا پھند نہیں کرتا، چندا تو پھر دس سال سے آ جا رہی ہے۔“ ناصر الدین نے دیر سے کہا تو صالحہ خاتون خاموش ہو گئیں۔

پھر وہ رکشے پر اسکول جانے لگی۔ ناصر الدین کچھ آرام میں آ گئے۔ وقت پر بے فکر ہو کے تیار ہوتے، دفتر جاتے صالحہ خاتون کی بھی کچھ ڈنسی الجھن میں کی واقع ہوئی تھی۔ اب

چندا کو رکشا والے کی وجہ سے وقت پر تیار ہونا پڑتا تھا پہلے جس طرح ہستر پر کسائی، کروٹیں لیتی رہتی تھی اب وہ عادت چھوڑنی پڑی تھی۔ صالحہ خاتون نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ ناصر الدین کو بتایا تو وہ خوش ہو کر بولے۔

”دیکھنا ہماری بیٹی بہت لائق نکلے گی۔“

”اللہ کرے، فی الحال تو رکشے والے کو ایڈوانس دینا ہے اس کا بندوبست کرو۔“

صالحہ خاتون نے کہا۔

”تو دے دو بھی! پیسے ہیں نا تمہارے پاس۔“

”کون سے! وہ چار ہزار جو آپ کی نئی سائیکل کے لیے جمع کیے ہیں۔“ صالحہ

خاتون نے غیر یقینی حالت میں لفظ چاچا کے ادا کیے۔

”ہاں! اور کون سے۔“

”مگر وہ آپ کی سائیکل کے لیے ہیں، دیکھتے نہیں روز کٹارہ سائیکل آپ کو ستری

کے پاس بھیج لے جاتی ہے۔“

”ممکنی اب کوئی خاص مسئلہ نہیں رہا، پہلے چندا کی وجہ سے گھبراتا تھا اب خراب بھی

ہوتی ہے تو مجھے فکر نہیں ہوتی، اور پیسے جمع کر لیں گے تم بس رکشے والے کو دے دو۔“

صالحہ خاتون نے شوہر کے کہنے کے مطابق رکشے والے کو روپے ایڈوانس میں دے

دیے اور خود جمع تقریر میں ستر سے لگ گئیں ہزار روپے مہینے کے اخراجات میں اضافہ

ہونے کا مطلب بھی تھا کہ انہیں اس وقت تک بہت دیکھ بھال کر خرچا کرنا ہے جب تک ناصر

الدین صاحب کی کٹخواہ میں سالانہ اضافہ نہیں ہوتا۔ ابھی نومبر کا مہینہ تھا مزید ایک ماہ ان ہی

چیروں میں گزارہ کرنا تھا۔ صالحہ خاتون بڑی دیر سے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، چندا

کمرے سے باہر نکلی تو پوچھ بیٹھی۔

”اماں! کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ چونکیں۔

”دک، کچھ نہیں۔۔۔۔۔ ذرا دیکھو تو چلے پر دودھ رکھا ہے کہیں اٹل نہ جائے۔“

انہوں نے کہا تو وہ کچن کی طرف چلی، کچھ دیر بعد صالحہ خاتون بھی وہیں آ گئیں اور دودھ

اٹلنے پر چلے سے اتار کے روٹی پکانے کی تیاری کرنے لگیں تو وہ بولی۔

”اماں! میں زنگ کے گھر سے ہواؤں؟“

”کیا؟ کیوں؟“

”وہ اس سے حساب کا ایک سوال سمجھتا ہے۔“

وہ ہلکائی۔

”پہلے باپ سے سمجھی تھی اب زنگ سمجھائے گی؟“ صالحہ خاتون نے ترخ کر پوچھا

تو وہ جھلکی۔

”ضروری تو نہیں ہے کہ باپ کو ہر سوال کی سمجھ ہو۔“

”اچھا! زیادہ حیرت پھیلاد۔۔۔۔۔ مغرب ہوگئی ہے کمرے میں جا کر نماز پڑھو۔“

صالحہ خاتون نے سختی سے کہا تو وہ پاؤں پٹختی کمرے میں چلی گئی۔

پھر وہ دونوں کھانے کے لیے اسے بلا رہے مگر وہ باہر نہ نکلی، صالحہ خاتون نے

ناصر الدین کو پتی پر بیٹائی سے بچانے کے لیے کوئی ذکر ان سے نہیں کیا دیے بھی اتنی بڑی بات

نہیں تھی مگر چندا نے جس طرح اس پر براہ مایہ وہ پریشان کن تھا۔ اگلی صبح صالحہ خاتون کو بخار تھا

وہ یہ مشکل ہستر سے اٹھنے لگیں، مگر ناصر الدین نے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کے دوبارہ

لٹا دیا اور چندا کے پاس جا کر اسے ناشتا بنانے کو کہا۔

”ابا! میں۔۔۔۔۔ مجھے تو ناشتا بنانا نہیں آتا۔“ بونی فارم استری کرتے ہوئے اس نے

جواب دیا تو ناصر الدین مسکرا کر بولے۔

”بیٹیا! صرف چائے بنا لو۔۔۔۔۔ میں رس لے آیا ہوں اور ہاں اپنی ماں کے لیے

ایک اٹھا اٹلنے کو رکھ دو اور بس!“

”ابا! میرا رکشا آجائے گا۔“ وہ جھکی۔

”اچھا! آجائے! رہنے دو، میں خود بنالیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خود چولہے کی طرف چلے

گئے۔ چائے کا پانی رکھا، پتی ڈالی آخر میں دودھ ڈال کے انہیں خیال آیا کہ چندا تو اچار پراٹھا

کھاتی ہے، تب وہ صالحہ خاتون کو اٹھا کے پراٹھا بنانے کا کہہ بیٹھے۔ بیٹی کے لیے ان کی محبت

دیکھ کر صالحہ خاتون ہولے سے مسکرائیں اور بخار بھول کر پراٹھا بنانے لگیں پراٹھا تیار ہوا تو

ناصر الدین خود اچار پراٹھا لے کر اسے دینے گئے جو اس نے جھٹ لے لیا۔ رات بھر کی بھوک

تھی جب وہ واپس صالحہ خاتون کے پاس آئے تو وہ بولیں۔

”بہت غصہ کرنے لگی ہے آپ کی لاڈلی۔“

”بہن! ہے، ہمارے سامنے غصہ نہیں کرے گی تو کسی کے سامنے کرے گی۔“

یوں ناصر الدین نے بیوی کو مطمئن کر دیا۔ وہ جج جج مطمئن ہو بھی گئیں ویسے بھی ان کی گھریلو مصروفیات ہی حدودِ رحمیں، ان دونوں کو بھیج کر گھر کے سب کام کاج انہیں تباہی کرنے پڑتے تھے۔ چندا کا تو ویسے بھی گھر میں ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا کام کاج سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ وہ بھی اب اسے کچھ زیادہ سختی سے نہیں کہتی تھیں کیوں کہ میزک کے لیے اسے ساری توجہ پڑھانی پڑھانی چاہیے یہ ناصر الدین کا اور ان کا اپنا بھی خیال تھا۔ لہذا وہ چپ چاپ سب کام خود ہی کرتی تھیں یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھی اکثر و بیشتر تو خود استری کر کے لٹکا دیتیں دھیرے دھیرے اس کو ماں پر آدھار ڈھالنے کی عادت ہی ہو گئی۔ وہ خود اگر کچھ بھول جاتیں وہ کہہ کر یاد کر دیتی۔ اسی طرح بہت سے دن گزر گئے۔ زندگی کی گاڑی دشواری سے کئی مکر توار کے ساتھ چل رہی تھی۔ صالحہ خاتون نے کسی نہ کسی طرح آمدن اور اخراجات میں توازن قائم کر لیا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہونے لگا تھا۔

خاموش سبک روی سے چلنے والی زندگی میں پہلا ارتعاش اس وقت پیدا ہوا جب صالحہ خاتون نے چندا کے یونی فارم کو استری کرتے ہوئے خوشی سے برآمدے میں تخت پر بیٹھے ناصر الدین سے کہا۔

”شکر ہے اب چندا کے کپڑوں پر تیل، اچار کے داغ دھبے نہیں ہوتے۔“

صالحہ خاتون کی بات سن کر ناصر الدین گویا اس کے شکر سے انہوں نے ناشتے کے لیے آواز دی تو وہ خراماں خراماں سی چل چکر ان کے قریب آئی اور پرغاٹا، اچار، دہی چینی دیکھ کر ناگوار سی شکل بنا کر انکار کر گئی۔ اسی اثنا میں رکشے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے اسکول بیک اٹھا کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

”چندا کے بالوں میں سرخ رہن ایچھے لگ رہے تھے۔“ ناصر الدین اس کے جانے کے بعد صالحہ خاتون سے کہنے لگے۔

”سرخ رہن! اچھا! شکر ہے اس لڑکی کو سلیقہ تو آنے لگا ہے۔“ صالحہ خاتون حیرت و مسرت سے بولیں تو ناصر الدین ان کی خوشی میں کہیں دور تک سفر کر گئے، لیکن صالحہ خاتون انہیں واپس لے آئیں۔

”کیا سوچنے لگے؟ آپ کا ناشتہ غصنا ہو رہا ہے۔“ اور وہ ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے

کے دوران ذہن جھجک کر وہ خاصے مطمئن سے ہو گئے۔

دفتر میں ان دنوں کام کی زبانی تھی شام تک بے ناصر الدین کو میز پر جھک کر کام کرنا پڑا تھا دراصل دفتر کو چھڑنے پر ڈچکلس پر کام کرنے کا رباب اختیار سے آدھار ملا تھا اس لیے دفتر کا سارا عملہ ہی کام میں مصروف تھا۔ ناصر الدین دھان پان سے آدھی تھکتی اور دیانت دار تھے۔ انہوں نے کام کو خود پر طاری کر لیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں درد بیٹھ گیا۔ پہلے پہل بکا رہا اور پھر شدت اختیار کر گیا اور ناقابل برداشت ہو گیا تو انہیں مجبوری ظاہر کر کے ایک دن کی چھٹی لینی پڑی اور معائنے کے لیے آرتھو پیڈک سرجن کے پاس جانا پڑا، جس نے انکسے بے بعد آرام کی تاکید کے ساتھ چند دوائیں لکھ دیں۔ دوا کی خرید کر وہ گھر پہنچے تو صالحہ خاتون نے جلدی سے انہیں بستر لگا دیا مگر وہ فکر مند تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے کم از کم پندرہ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں بالکل درمیان کا مہرہ کچھ ڈسٹرب ہوا تھا جس کی وجہ سے آرام زیادہ ضروری تھا مگر دلی طور پر سخت پریشان تھے کیوں کہ ان کے ذمے جو کام تھا وہ پندرہ دن موخر نہیں کیا جاسکتا مگر ورود کی شدت نے انہیں یہ سوچنے کی اجازت نہ دی۔ اب تقریباً تین دن ہو گئے تھے وہ مسلسل بستر پر تھے بس صالحہ خاتون سے باتیں کر لیتے۔

سودا سلف بھی صالحہ خاتون خود لائیں، وہ بس لینے لینے دیکھتے رہے۔ چندا معمول کے مطابق اسکول جا رہی تھی، آ رہی تھی، جاتے ہوئے انہیں مل کر سلام کر کے جاتی تو وہ یہ غور سرے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتا نہ بھولتے۔ اس وقت بھی رکشے کی آواز آئی اور چند منٹ بعد وہ ان کے تخت کے قریب پہنچی تو حسب معمول سلام کیا۔ ناصر الدین تھکے۔

”وعلیک السلام۔“ ان کی نظریں اس کے کانوں میں جھونکی بڑی بڑی بالیوں پر تھیں۔

”ابا کیسے ہو؟“ وہ خبریت پوچھتے بیٹھ گئی تو وہ الگ سے انداز میں بولے۔

”بیٹے! اسکول میں بالی بندے پہن کر جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”اوہ ہاں! وہ آج پارٹی تھی اس لیے پہن لیں۔“ وہ جلدی سے ہاتھ سے بالیاں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

”اچھا! جاؤ کپڑے بدل کر کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا تو وہ تیزی سے بیک لیے کرے میں چلی گئی۔ ناصر الدین سیدھے لیٹ کر کچھ سوچنے لگے۔

چوتھوں تھا جب وہ کچھ بہتر محسوس کر رہے تھے اور کافی خوش تھے کہ ٹھیک ہو رہے ہیں۔ لیکن بات وہ صالحہ خاتون سے کہہ رہے تھے کہ چنداں گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اسکول جانے کی اجازت لی۔

”ہیں! ابھی رکشا تو آیا نہیں!“ صالحہ خاتون نے حیرت سے کہا۔

”رکشا نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ وہ اپنی بہن کی شادی میں گیا ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا تو ناصر الدین نے اس کی جھکی پکوں میں جھانکنے کی کوشش کے ساتھ کہا۔

”تو آج چھٹی کر لو بیٹا!“

”چھٹی، کیوں؟“ چونک کر انھیں پوری کھولیں تو ناصر الدین نے اپنی ٹانگیں چرا

لیں اس کی جگہ صالحہ خاتون نے کہہ دیا۔

”اکیسے کیسے جاؤ گی؟“

”اماں! ایرائیٹ ہے اور پھر ایک دن کی بات تو نہیں ہے، وہ ایک ہفتے کے بعد

آئے گا۔“

”لو پھر میں چھوڑ آتا ہوں۔“ ناصر الدین نے اٹھتے ہوئے کہا تو صالحہ خاتون نے

خنتی سے منع کر دیا اور اسے اجازت دے دی۔

”جاؤ، بزمس وغیرہ بھی ساتھ ہوں گی۔۔۔۔۔ چار قدم پہ تو اسکول ہے۔“ وہ خوش ہو کر

دروازہ عبور کر گئی۔

”یہ بزمس وغیرہ کیسی بچپان ہیں؟“ ناصر الدین نے بیوی سے پوچھا۔

”اچھی بچاری بچپان ہیں، ابھی کبھار آتے جاتے دیکھا ہے۔“ صالحہ خاتون نے

سرسری انداز میں کہا اور ناصر الدین کی دوا سنیں ٹکائے لگیں۔

پھر وہ مسلسل ہفتہ بھر پیدل اسکول جاتی رہی۔ اس کے جانے اور آنے تک

ناصر الدین کافی شکر سے رہے۔ کئی بار انہوں نے صالحہ خاتون سے کہا کہ جا کر خود لے

آئے ہیں مگر صالحہ خاتون تیسروں پر ہو کر پھرتی تھیں۔

”کمال ہے بھئی۔۔۔۔۔ سائیکل پر جھٹکے گا کہ دربارہ مسئلہ کڑا کرنا چاہتے ہو کیا؟“ وہ

چپ ہو جاتے کیوں کہ صالحہ خاتون بھی غلط نہیں تھیں، ڈاکٹر کی یہی ہدایت تھی کہ خود بھی جانتے

تھے کہ سائیکل چلانے سے دوبارہ مرض جاگ سکتا ہے، وہ تو ایک ایک دن گمن گمن گزار رہے

تھے۔ آدی کو بیکار رہنے سے سکون ہی کب ملتا ہے وہ لپٹے لپٹے بیڑا سے ہو گئے تھے، بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کریں، اخبار پڑھنا، کتاب پڑھنا اور بس لی وی جریس دیکھنا! ابھی مصروفیت رہ گئی تھی جس سے وہ اکتا گئے تھے اس لیے صالحہ خاتون کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ اٹھ کر پھر دھیرے دھیرے ٹپٹے کلتے مگر اس سے بھی جی بھر جاتا تو پھر لیٹ جاتے۔ اس وقت بھی صالحہ خاتون ان کے چہرے پر پھیلی بیزارسی واضح طور پر دیکھ رہی تھی، سب کام نشتا کے سبزی خریدنے نہ جانے لگیں تو وہ اٹھ گئے۔

”لاؤ اس سبزی لاتا ہوں۔“

”تم نہ ہی لانی ہے براہی نہیں، میں یوں مٹی اور یوں آئی۔“

”اب میں اتنا بھی پیار نہیں ہوں، لاؤ یہ نوکری مجھے بکلاؤ۔“ انہوں نے بہت

نجیدگی سے کہا۔ پھر صالحہ خاتون کی ایک نہ چلی، وہ نوکری لیے دھیرے دھیرے چلے ہوئے

گھر سے باہر نکل گئے۔ صالحہ خاتون نے ان کی غیر موجودگی میں ان کا بہتر بھائی کے ٹھیک کیا،

کچے کا کور بولا، رضائی دھوپ میں پھیلائی اور اخبار، برسالے، کتابیں سیٹ کر کرپنے سے

رکھیں، کچھ دیر گھنٹوں میں بچے پلنگ پر بیٹھ گئیں، دھوپ اچھی لگ رہی تھی جسم میں سکون سا ترنے

لگا، دل چاہا پاؤں پھیلا کر سو جائیں۔۔۔۔۔ مگر وہ پھر کا کھانا پکانا تھا، وہ ناصر الدین کا صرف انتظار

کر رہی تھیں مگر وہ دھوکے کھانے گزرنے کے باوجود نہیں لوٹے تھے انہیں حیرت بھی تھی اور تشویش بھی،

پھر خیال آیا کہ صبح اپنے بوسے ہونے بال دیکھ کر وہ ابھن کا شکار تھے شاید بال کنواں لگے

ہوں، مگر ان کا یہ خیال بھی غلطی تھا۔ آخر بال کنواں میں تھی درگتی، دو سے تین گھنٹے گزر

گئے تو وہ پریشانی میں اٹھ کر گھنٹوں میں ٹپٹے لگیں۔۔۔۔۔ انہیں فکر دامن گیر تھی کہ چپا کے اسکول سے

آنے کا وقت ہو گیا ہے اور اب تک کھانا نہیں پکا، پھر وہ جلدی سے اس نتیجے پر پہنچیں کہ پہلے

ردیاں پکا کر رکھ لیں جیسے ہی سبزی آئے گی تو جلدی سے سان پکالوں گی۔ ابھی تو ہے پر پھلی

روٹی ڈالی تھی کہ چپا آگئی اس کے ساتھ ہی ناصر الدین ایک ہاتھ میں سبزی کی نوکری لیے

کھڑے تھے اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا جسے وہ اضطرابی حالت میں انگلیوں کے

درمیان دبا کر تھما رہے تھے۔ چپا بیک لیے اندر کمرے میں چلی گئی تو ناصر الدین نے ہلکا سا

جھک کے سبزی کی نوکری صالحہ خاتون کے سامنے رکھی، جھٹکے کے باعث ہلکی سی درد بھری آہ ان

کے منہ سے نکلی مگر ضبط کر گئے۔ گلاب کا پھول دھلے ہوئے برتنوں کی نوکری پر رکھ کر اپنے

تخت کی طرف بڑھ گئے۔ صالحہ خاتون جلدی جلدی سبزی دھو کر کھانے لگیں۔ حتیٰ جلدی انہوں نے سبزی کاٹی اس سے بھی جلدی پکانی پھر مڑے میں کھانے لے کر ان کے پاس آئیں وہ تخت پر بالکل سیدھے لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ انہوں نے میز پر ٹرے رکھ کے چندا کو آواز دی اور انہیں کھانے کے لیے کہا تو وہ کھوئے کھوئے سے اٹھ بیٹھے اور زہر مار کرنے لگے جب کہ چندا نے پہلے انکار کیا پھر صالحہ خاتون کے اصرار پر کھانے کے لیے آ بیٹھی، ناصر الدین چلیں جھانکے کھانے سے کیلتے رہے، صالحہ خاتون نے بغور انہیں دیکھا اور بولیں۔

”آپ کو کیا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا!“

”ہوں! ہاں!“ وہ بولے۔

”لگ تو پریشان رہے ہیں۔“

”ابا! تم میرے لیے پریشان نہ ہو، اکروہ میں آرام سے پھیل آ جاتی ہوں۔“ چندا

نے کہا۔

”کون سمجھائے انہیں یہ بات چار قدم پر اسکول ہے۔“ صالحہ خاتون نے چندا کے

ساتھ ہاں میں ہاں ملائی۔

”ان چار قدموں میں صدیوں کا پیلاؤ ہے ہر دوسرے قدم پر کھائی ہے اور سب چلنے والوں کو کھائی نظر نہیں آتی۔“ ناصر الدین نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ صالحہ خاتون نہ سمجھتے ہوئے خود بھی کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ بولیں، چندا برتن ٹرے میں رکھ کے چلی گئی اور ناصر الدین نے صالحہ خاتون کو پریم لگا ہوں سے دیکھا اور کہا۔

”بیٹی کی سمجھ کو اپنی نا سمجھی کی کسوٹی پر مت پرکھو، میں جیسے تیسے خود چندا کو چھوڑنے اور لینے جاؤں گا۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے اس میں پریشانی کیا ہے؟“ وہ اونچی آواز میں بولیں۔

”آہستہ بولو! اور سنو! کبھی کبھی کپڑوں پر لگے داغ دے بہت بڑے پاسبان کا محافظ بن کر حفاظت کرتے ہیں، سب داغ ایک جیسے نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر داغ دھبا بد نما ہے۔ چندا کے لباس پر تیل چکنائی کے داغ دے جب تک لگتے تھے، میں بے فکر تھا بے فکر تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے خوف زدہ اور ڈرا ہوا سمجھا ہوا تھا، جانے کیوں دو قدم پر پڑنے والی کم

تہہاری جگہ مجھے نظر آنے لگی تھی۔

صالحہ! سب سے پہلے اس طرح کی کھائیوں میں وہ گرتے ہیں جنہیں سنبھال سنبھال کر ہم چلنا سکھاتے ہیں اور بے فکر ہو جاتے ہیں، کپڑوں سے داغ منٹنے پر خوش ہوتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ داغ کیسے اور کس ڈنر جنٹ سے صاف ہوئے ہیں، جنہیں بھی یاد نہیں رہا کہ تہہارے گھر میں وہ ڈنر جنٹ آ گیا۔ ادھر دیکھو! وہ گلاب کا پھول میں نے اپنی چوکت سے اٹھایا ہے، چندا کے قدم نہیں پڑنے دیے۔“ ناصر الدین نے بہت کچھ کہہ کر گردن گھماتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مہبوت بیٹھی صالحہ خاتون کو برتنوں کے اوپر رکھے سرخ گلاب کے پھول کی طرف متوجہ کر لیا۔ مگر صالحہ خاتون تو اس سے تاپنا تھیں۔ ان کی آنکھوں میں تو شدت کی گہری دھندلہ اتر چکی تھی وہ صرف ناصر الدین کے ہاتھ کا اشارہ دیکھ کر کئی تھیں اور بس!!!!



اندر کالج ہی ہے۔“ صبا نے کچھ چڑکھا تو نجمہ نے مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے فقط اتکا کہا۔

”جاؤ جا کر یونیفارم بدلو، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاؤ۔“ صبا نے ماں کے کہنے پر سیدھے اکلوتے کمرے کا رخ کیا۔ اس کے جاتے ہی اماں نے دھیرے سے کہا۔
”نجمہ! اس معصوم کو تو حصہ بھر آزاد زندگی بسر کرنے دے، تو اس قدر دہی اور شکی کیوں ہوتی جا رہی ہے؟“

”اماں! کیا تم نے میرے اندر اتر کر نہیں دیکھا کہ یہ وہم اور شک کیا ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اماں کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں شاید دور دور تک اس نے زیادہ خوف اور پریشانی کا گھنا جھل پھیلا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی صبا کی وجہ سے اکثر فکر مند ہو جاتی تھیں مگر نجمہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایسے ہی ٹال مٹول سے کام لیتی تھیں۔

”چھڑو بیکار کی بیٹھ، خاتونا، ہی کر سکتی رہتی ہو، ہماری صبا صبرت سمجھدار ہے، اس کے لیے تو میرے پاس اتنا زور موجود ہے کہ اچھی طرح اس کی ڈولی اٹھ سکے۔“ اماں نے نجمہ کے ڈولتے دل کو مضبوط بادیاں کا سہارا دیا مگر پھر بھی وہ انجانا سا خوف اس کے چہرے اور آنکھوں سے دور نہ کر سکیں۔

”انتشاء اللہ میری صبا کی ڈولی شان سے ہی اٹھے گی۔“ وہ زرب لب بڑبڑائی۔ اماں اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں تو نجمہ کے ہاتھ مشین کے پیسے پر حرکت کرنے لگے۔ پورے کمر میں مشین کے گھڑ گھڑانے کی آواز کو نیچے لگی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کچھ دیر کو اپنے اندر کے انجانے خوف سے باہر آ گئی ہے۔ یہ مشین نجمہ کے لیے کھاسا سراس مشین تھی جس کی تیزی سے پیہر گھومتا اتنا زیادہ نجمہ کو خوف سے نہایت ملتی تھی۔ یہ مشین کی حرکت ان کی معاشی معاون بھی تھی اور اس کی ضرورت بھی کیونکہ گھر کی گاڑی چلانے کے لیے وہی آسے تھے ایک اوپر کا چوہا دو جوا ہوا کرانے پر دے رکھا تھا۔ اس کے ڈھائی ہزار ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ملتے تھے جس سے صبا کی فیس، بجلی کا بل اور گیس کا بل بمشکل بھرا جاتا تھا۔ بسا اوقات بل زیادہ آ جاتا تو پیسے پورے کرنے مشکل ہو جاتے تھے۔ ایسے کڑے وقت میں گھر کا چولہا جلانا مشکل ہو جاتا تھا بس جیسے جیسے حالات زور رہتے تھے۔ رات دن سلائی کر کے وہ مشکلات سے لڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی زیادہ تنگ ہو جاتیں تو کرم بخش کو دل ہی دل میں طعنے دیتے لگتی یہ

چکر

جیسے ہی دروازہ کھول کے وہ اندر آئی تو محسن میں بیٹھی نجمہ نے دروازے پر بھی ٹکا جیسے کچھ گہری جلد تھکن دور کرنے کی کوشش کی۔ تخت پر بیٹھی اماں نے سکھ کی طویل سانس بھری اور دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔

”جتنی دیر تیری آنکھیں دروازے پر جمی رہتی ہیں میری سانسوں کی مٹائیں کبھی رہتی ہیں۔ مجھ و سا کرنا سکھ کہ میری بوڑھی سانس اب بہت دیر تیرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔“ اس نے سلائی مشین کی صفائی کرنے سے پہلے ان کی طرف دیکھا اور پھر صبا کو دیکھ کر بولی۔

”آنکھیں تو اب میری جھنکے لگی ہیں۔ اٹھارہ سالوں کی تھکن پتلوں پر پچھے جمائے بیٹھی ہے مگر ابھی چند سال، چند بیسے مجھے اس عمل سے گزرا ہے۔“

”بیکار کے دوسرے دن سے نکال دو تو سب ٹھیک ہے، بلا وجہ زندگی مشکل بنا رکھی ہے۔ رات دن مشین کا پیہر گھماتی ہو پھر بھی اچھے وقت کی امید نہیں رکھتیں۔“

”پیسے کے گھوٹنے سے ہی تو پتا چلا ہے کہ یہ گھوم کر بار بار بائی جگہ پر آتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں وقت کا پیہر گھوم کر واپس آئے۔“ وہ انجانے سے خوف سے زرد پڑ گئی تو صبا نے براہ راست اماں سے پوچھا۔

”نانو۔۔۔ یہ ای کا مسئلہ کیا ہے، میں کالج جاتی ہوں یا کسی محاذ پر۔۔۔ ایسے کیوں سر سے پیر تک گھورتی ہیں؟“

”ماں ہوں تمہاری کوئی دشمن نہیں، ہمسائے مگرانی کریں گے کیا۔۔۔؟“ نجمہ۔
خوف پر ممتا کی مٹھاس چڑھا کر اماں سے پہلے اسے جواب دیا۔

”امی کس بات کی مگرانی، گلی سے سڑک اور سڑک سے بس، کالج کے گیٹ۔“

جانتے ہوئے بھی کہ کریم بخش کو دنیا سے گئے تیرہ سال ہو گئے اور وہ اب ایسی دنیا میں جا رہا ہے جہاں سے وہ تو کیا کوئی بھی واپس نہیں آ سکتا ہے اور نہ کوئی مدد کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ یہ بات بھی اماں کو ہی تجربہ کو سمجھانی پڑتی۔

”کیوں خون جلاتی ہے وہ آکر تجھے جواب نہیں دے سکتا۔“ تب وہ بیٹے پر صبر کی سل رکھ کر سوچنے لگتی۔ جس نے عمر بھر مزاح زندگی آوارگی کو سمجھا وہ سر چھپانے کو پانچ مرے کا وہ منزلہ گہری چھوڑ گیا تو بڑی بات ہے درندہ اور اس کے پاس تھا ہی کیا، رنگ اور برش جن کو وہ بیخ بخر میں ایک آدھہ بار استعمال کرتا، ہنر مند تھا مگر فطرتاً آزاد منش رنگین مزاج جس کی وجہ سے کئی کئی روز تو گھر کا رخ ہی نہیں کرتا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو ایک چار پائی پر صرف ایک میلا کچھلا گدا تھا جسے وہ آدھا آدھ زنا تھا اور آدھا بچھا تھا۔ گرمی سے اسے گھر میں خالی خالی درد دیواروں کے درمیان اسے اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا تھا۔ زرتاری کھوکھ کی اوٹ سے اپنے خواہوں کی جنت دیکھ کر شدت غم کے باعث موٹے موٹے آنسو ٹوٹ کر خساروں سے پھسلنے ہوئے جمبولی میں گر گئے تھے اس وقت اسے اپنی بچی اماں سو تیلی لگیں باپ کے نہ ہونے کا غم شدت سے جاگا کہ اگر ابا ہوتے تو اس میں مجھے عرقید کی سزا نہ دی جاتی، اماں نے کیا دیکھا۔ کیا اچھا سوچا کہ اس بھڑا میں جھوک ڈالا مگر کریم بخش کے گرم بھاپ دیتے جذبات کے اعتبار نے اس کے ذہن کو پرسکون کر دیا۔ اس کے گھر میں شاید اس کی لودتی محبت ہی سب سے زیادہ قیمتی اور کثرت سے ملتی۔ رات وہ اس کی محبت کی آغوش میں سب کچھ بھول بھال گئی۔ اس حقیقت کا کریم بخش کو یقین تھا شاید اس میدان کا وہ پرانا تجربے کا رکھلاڑی تھا۔ پہلی شادی طلاق پر ختم کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے گھر کے خالی ہونے کے باوجود اسے بنا کسی فکر اور ابھسن کے اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا کہ اس کی بے پناہ محبت عورت کا دل جیت لے گی۔ ایسا ہی ہوا تھا اگلی صبح وہ ہشاش بشاش تھی۔

ایک دن کے لیے جب اپنے گھر آئی تو اماں کے پہلو سے لگ کر فقط اتنا پوچھ پائی۔ ”اماں! خالی گھر میں ایک شادی شدہ مرد سے تم نے اپنی کنواری بیٹی کی شادی کیوں کر دی؟“ اور اماں نے اس سے حسرت بھری ایک نگاہ سرغیوں کے ڈیرے پیسے گھر پر ڈالی اور اس کے سر کے بالوں میں سے ایک سفید تار نکال کر اس کی پھٹی پر رکھ دیا، وہ سب سمجھ گئی سب جان

گئی کہ اماں کی مجبوری تھی۔ اس کے بعد اسے صبر سا آ گیا۔

کریم بخش کا احسان تھا کہ اس نے اسے اپنا اپنا تھا درندہ ان کی دہلیز پر کسی نے تجربہ کے لیے قدم نہیں رکھا تھا۔ کریم بخش بھی اس کے لیے بہت عظیم بن گیا۔ اس میں ہر طرح کا عجب تو نہیں تھا، پر دوسری خاتمن میں دلچسپی لینا، لڑائیوں کو چھیڑنا، آوازیں کنا، تنگ کرنا اور پھر حرہ لینا یہ اس کی عادتوں میں شامل رہا تھا۔۔۔۔۔ بے شمار مشق لڑا چکا تھا۔ ایک عیسائی لڑکی کو تنہا کے ذریعے مشق کرنے پر مجبور کیا جس سے وہ شدید زخمی ہوئی اس کے گھر والوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرانی تو دو تین سال کے لیے کراچی کا چھاپا جب معاملہ دب گیا تو واپس آیا پھر پرانی مسائی اماں جتن سے ترس کھا کراچی دور کی بھانجی سے شادی کرادی تاکہ اس آوارہ مزاج کا گھر بس جائے اور یہ راہ راست پر آجائے چند دن ایسا ہوا مگر مزاج کی آوارگی نے سکون نہ لینے دیا۔ یاروں، دوستوں کے ساتھ ہر وقت تفریح کے لیے، میلوں ٹیبلوں کے لیے گھر سے غائب رہتا۔ حد سے زیادہ تنہا کرتا، وہ روٹی دھوئی اپنی قسمت پر کڑھتی رہتی، اللہ نے بھی دے دی تب بھی وہ راہ راست پر نہ آیا۔ وقت کی ختمیاں جھیلنے کے باوجود اس عورت کو طلاق کا گہنا پیتا کر گھر سے نکال دیا۔ پانچ سالہ بیٹی کو بھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ یہ سب باتیں شادی کے تیسرے دن ہی ضعیف بیمار جتن سے اسے بتا کر چوکانا کیا تھا۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کا اس کی اپنی اماں کو شائبہ تک نہیں تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ ایک انجانا سا خوف چلا نک مار کر اس کے اندر اتر گیا اور پھر اسے کوشش کے باوجود نہ وہ خود نکال سکی اور نہ کریم بخش کے اندر آنے والی تبدیلی اس کی بے پناہ محبت ہی اس کے وجود پر مکمل خوف اور دم کے پھول اُتار سکی۔

کریم بخش اسے پا کر بدل چکا تھا۔ شاید جوانی کا جوش بڑھ چاہے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا وہ اب صرف اس تک محدود ہو گیا تھا۔ کام کاج پر بھی وہ مہیاں دینے لگا تھا اوپر کی منزل مرمت کرا کے کرائے پر دی تو کچھ مطمئن ہو کر بلا تھا۔ ”نجر! اب ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔“ نجر نے اس کی تائید میں گردن ہلا دی تو وہ خوش ہو گیا تھا۔

رنگوں سے کام لینا اسے اچھی طرح آتا تھا تو لگ اس کے ہنر کی قدر کرتے تھے، کام اچھا مل پڑا تھا تب اس کی کوکھ میں مہانے پر گوش کی وہ مٹا کے احساس سے توکل ابھی مگر خوف نے اور زور کر دیا کہ کریم بخش کی خوشی دیدنی تھی۔ اسے بازوؤں میں اٹھا کر خوب پیار کیا اس کے ہاتھ اٹھانے لگا۔ ایک دن خوفزدہ ہو کر اس نے کہا۔

”آپ تو اس طرح خوش ہو رہے ہو جیسے ہمارے ہاں اولاد ہونا تو کبھی بات ہے۔“
پہلی بار کریم بخش کے چہرے پر پھٹکی شہری کرشمہ اندھیرے میں بدل گئیں اور اس کی آنکھوں
میں جھلک کنارے دکھائی دیے۔

”گمشدہ خوشیوں کی حلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ نجمہ اس کے اس جملے سے
بہت کچھ سمجھ گئی۔ اس کے بعد کریم بخش کو کافی مضطرب سا دیکھتی۔ اکثر وہ کہیں دور نکل جاتا۔
سامنے رکھی چائے کی پیالی سرد ہو جاتی۔ ہاتھ میں پکڑا نوالہ منبک جاتے جاتے رہ جاتا۔ نجمہ
اس تبدیلی پر کبھی ہراساں ہی ہوتی اس کے اپنے اندر کا خوف اور کریم بخش کے چہرے کا کلال
دونوں ہی سامنے لگے ڈاکٹر نے اسے خوش رہنے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اماں کو کریم بخش
نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ خود جا کر کرائے کا گھر خالی کر لیا اور اپنے ہاں لے آیا۔
اماں ماشاء اللہ چاق و چوبند تھیں مجرہ کو بستر پر لٹا کر سب کام سنبھال لیے۔ باقی کریم بخش کی
آمدن بھی ہی مختصر جس سے چلھا چٹا مشکل تھا دیگر لوازمات پرہے ہونے مشکل تھے۔ ایسے
میں اماں نے کئی بار اپنا بھاری ساز یور پیچے کی کوشش کی جو ان کے بھول جرنے کے لیے ہی محفوظ
کر رکھا تھا تاکہ کسی بُرے وقت میں کام آئے مگر کریم بخش نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا اور
اپنی ذمہ داری خود اٹھانے کو کہا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب وہ مرکز صحت میں داخل ہوئی۔
روٹی کے گالے جیسی مہیا دنیا میں آئی تو کریم بخش کی آنکھوں سے سادوں کی جھری لگ گئی۔
نجمہ بے چین ہو گئی استفسار کیا تو وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

”اس کی بڑی بہن جانے کس حال میں ہوگی؟“

کریم کا یہ جملہ اسے ہلا گیا۔ وہ قہر قہر کا پھنپنے کی اسے چاروں طرف سے آوازیں
آنے لگیں۔ مختلف آوازیں جو اسے سمجھوڑ رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر وہ اماں
سے بولی۔

”اماں! میں اور میری بیٹی یہ قصور ہیں پھر مجی میرا دل کیوں کانپ رہا ہے؟“ اور
اباں کو اس کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے اپنی دانست میں تلی دے دی۔

”وہم نہیں کرتے، وہم چاٹ جاتا ہے انسان کو۔“

یوں بات آگئی مگر یہ وہم اس کے دل دو مارغ کا مستحق روگ بن گیا۔ کریم
بخش بالکل بچہ کر رہ گیا تھا محبت سے گول مثل میں صبا کو گود میں اٹھاتا تو آنکھیں بھر آئیں، دل

بے قابو ہو جاتا اسے بستر پر ڈال کے باہر نکل جاتا۔ اسے جو دکھ چاقا جاتا تھا وہ مکمل کر پوچھنے
کا موقع نہ ملا ابھی صبا تیرے سال میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک رات وہ سویا تو بھر ج
اٹھ نہ سکا۔

کریم بخش کو اپنی ذات کا دکھ لے گیا۔ وہ تنہا ہو گئی۔ نخی صبا اور اماں کے ساتھ
جینے کا حوصلہ اکٹھا کیا۔ جھڑکی سلائی مشین سنبھالی اور اماں کی عطا کردہ اس ہنرمندی کو سراہنے
لگی، اچھائی کیا تھا کہ میزک کے بعد سلائی کا کورس کرادیا تھا۔ اس نے اس طرح مشین کو
اپنی زندگی میں شامل کیا کہ قریبی محلوں سے کپڑے سٹلے کے لیے آنے لگے۔ اسے سر
اٹھانے کی فرصت نہ رہتی۔ مگر جو بھی صبا پر نظر پڑتی تو سب کچھ چھوڑ بھاڑ کے اسے ہاتھوں میں
بھر لیتی، چومنے لگتی۔ اماں نے یاد دلایا تو اسے یاد آیا کہ بیٹی کا سکول داخل کرانا ہے۔ بس پھر
یہ مصروفیت بھی شامل حال ہو گئی، صبا کو تیار کر کے اسکول چھوڑنے جانا، لینے جانا اور جتنے وقت
وہ اسکول میں ہوتی تو بار بار گزری کی سونویں کو دیکھنا اور بیٹھے بیٹھے خوف سے پہلے پڑ جانا۔ اماں
کی نظر پڑتی تو وہ پوچھنے لگتیں۔

”یہ تمہیں ایک دم کیا ہو جاتا ہے؟“

”انجانا سا خوف قہقہہ لگتا ہوا سامنے آ جاتا ہے۔ میری صبا معصوم ہے، اماں! وہ
کرنی کا پھل نہیں کھا سکتی۔“ وہ تقریباً رد ہوتی تو اماں بھی نا کبھی کے درمیان کچھ دھیر ہو لے
کے بعد کہتیں۔

”تقدیر کے فیصلے قبول کرنا سیکھو، خوف سے باہر نکل جو کل ہوتا ہے اسے آج سوچ
سوچ کے پریشان ہونے سے قانع ہو، جہیں جو خوف ہے وہ تباہ تو ہوتا چلے۔“

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ وہ کسر ٹال دیتی۔ وہ اماں کو بتا کر پریشان کرنا نہیں
چاہتی تھی۔ مگر خود کو بھی پریشان ہونے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ صبا شہر کی سڑکیاں طے
کر رہی تھی اور اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے کندھے میں چلانے کی وجہ سے
کمزور ہو رہے تھے اور اس کی نگاہیں دروازے تکنے کے باعث کمزوری کی طرف مائل تھیں۔
بلکہ اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ دروازے کے قریب بیٹی کا بچہ بھی گزر جاتا تو وہ پر تشویش اعجاز
میں دروازہ کھول کے مگلی میں دائیں بائیں تک نگاہوں کا کیرا لگے کافی دیر کمزری رہتی۔ صبا
جو نیزہ اسکول سے فارغ ہو کر اب علاقے کے ہائی اسکول میں جاتی تھی۔ اس کی تشویش اور

”اللہ مالک ہے، فی الحال دوا لے کر آؤ۔۔۔۔۔“ اماں نے کہا تو اسے چادر اٹھا کے اٹھتا پڑا۔ ڈاکٹر کے پاس اچھا خاصا رشتہ، اسے گمان گزرا کہ مباح کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر بتا دوائی لیے ہی واپس آ گئی۔ تیز تیز قدموں سے آ رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے پکارا۔

”چاچی۔۔۔۔۔ بات سن۔۔۔۔۔“ اجنبی، ناگوار لہجہ تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹکچے شلوار قمیض میں کھلے گردن کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا جسے وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔۔۔؟“ وہ حیرت سے فقط اتنا ہی پوچھ گئی۔

”چاچی! مجھے تیری بلو کا ہاتھ چاہیے۔ بول کب رشتہ بچوں۔۔۔؟“ انتہائی بے باکی سے اس نے یقیناً مباح کو ہی بلو کہا تھا۔۔۔۔۔ اور اسے بیٹھو سے انداز میں بات کی تھی۔ خلاف توقع اتنا بڑا ہم اس پر گرا کہ وہ لڑکھڑائی۔ توازن برقرار نہ رہا، پکرا کے وہیں گر گئی۔ خوف کی یہ شکل اسے برداشت نہ ہوئی۔ وہ وہاں سے ہوا ہو گیا اور جانے کن ہمدرد لوگوں نے اسے گھر پہنچایا۔

ہوش آنے پر بھی وہ بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھی۔ مباح کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے سر ہاتھ میں بیکڑے نہ چھت گھوری تھی۔ اماں پو پو پو پو کے ٹھک ٹھک کی تھیں مگر وہ بول رہی تھی اور نہ کچھ سن رہی تھی۔۔۔۔۔ مباح بھی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دم ہی اس کی کھلی آنکھوں سے اشکوں کا ریلا بہنے لگا۔ دائیں بائیں سے بکیرے پھینکتے لگا۔

”ای، ای! کیا کیا ہے بتاتی کیوں نہیں ہیں۔۔۔؟“ مباح نے پیار سے اس کی ہانسی آ نکھیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیں۔ مگر وہ شدت غم سے اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی پھر اماں اور مباح اس کی چپ کے سامنے ہار گئیں اسے اس کی چپ کے حوالے کر دیا۔

دو دن وہ اسی حالت میں رہی تیسرے دن صبح مباح کالج کے لیے تیار ہو کر باہر آئی تو وہ بولی۔

”مباح! کالج نہیں جانا جتنی پڑھائی کر لی، وہ کافی ہے۔۔۔۔۔!! یہ سن کر اماں دنگ رہ گئیں۔

”پاگل ہو گئی ہو، دو سال کی محنت اکارت بھیجی ہے، کیا خناس سا گیا ہے تمہارے دماغ میں۔۔۔۔۔“ اماں نے کہا۔

”ہاں! پاگل ہو گئی ہوں، بس کہہ دیا میں نے کہ کالج نہیں جانا۔۔۔۔۔“ وہ چلائے لگی۔ ”کان کھول کے سن لو، مباح جانے گی، استقامت دے گی۔۔۔۔۔ آگے چپک نہ بیٹھنا۔۔۔۔۔“ اماں نے دونوں سچے میں کہا اور مباح کو لے کر دروازے کے باہر پھوڑ کے آئیں۔

وہ بے بسی سی رو دی۔۔۔۔۔ اماں کو دل کی بات نہ بتا سکی۔ اماں تو اسے پاگل اور دہمی سمجھنے لگی تھیں۔ وہ انہیں اپنی اصل بات بتا ہی نہیں سکتی تھی۔

اس کے کندھے کا درد در در پکڑا گیا تھا۔ متواتر علاج نہیں ہوا تھا۔ نہ آرام کرتی تھی اس لیے اس میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اماں نے خود ساتھ جا کر ڈاکٹر سے چپک کر لایا اس وقت بھی آ کر گرم دودھ کے ساتھ گولیاں کھلا کر فارغ ہوئی تھی۔ مباح سرے میں بند استخوان کی تیاری کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی وہ چونکی۔ اماں نے دروازہ کھولا تو ایک اماں کی ہی ہم عمر خاتون اندر آ گئیں۔ سفید پکڑوں میں بڑا سا چادر نما دو پٹا اوڑھے۔ اماں نے تعجب سے دیکھا اور پوچھا۔

”جی، کس سے ملنا ہے۔۔۔۔۔؟“

”بیٹھ کر بات کر لیں تو اچھا ہے۔۔۔۔۔“ خاتون نے بے تکلفی سے نجر کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھنے ہوئے کہا۔ اماں بھی نجر کی پانچویں کی طرف بیٹھ گئیں۔

”میں رشتے کرنا ہی ہوں، میرے پاس اچھے اچھے گھروں کے رشتے ہیں۔“

”ہیں کیوں بتا رہی ہو میں نہیں کرنا رشتہ۔۔۔۔۔“

نجر نے درمیان سے اس کا جملہ پھین کر جلدی سے کہا اور ناگواری سے گھورا۔۔۔۔۔ وہ خاتون پریشان ہو گئی۔

”اچھا، اچھا مرضی ہے، میری بات تو سن لو۔۔۔۔۔“ وہ کچھ تنجیدگی سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”تیسری لگی میں راتی ہوں، سب کا مجھے پتا ہوتا ہے۔ تمہاری جوان بچی ہے، ٹھیکیدار صاحب کا منڈا جوان ہے سو ہونا اچھا ہے، مجھے ٹھیکیدار صاحب کی بیوی نے کہا تو میں آ گئی۔۔۔۔۔“

”انہیں کیسے پتا چلا کہ میری بچی جوان ہے، بولو۔۔۔؟“ نجر کڑک کر کہی۔

”نجر! کیا ہو گیا تمہیں، جوان بچوں کی خوشبو خود بخود پھیل جاتی ہے۔“ اماں نے اس کے ارادہ انداز پر دیر سے سے سمجھایا۔ ”بی بی! تمہاری مرضی نہیں ہے تو نہ سکی۔“ وہ خاتون

”بس ابھی میری مہا کی عمری کیا ہے، کم گہنیں اور چلتے ہیں۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے، محلے بدلے سے کیا ہوگا۔ تباہ کی بچیوں پر لوگ اسی طرح نگاہ رکھتے ہیں، ہم جلدی شادی کروں گے تو یہ مسئلہ نہیں رہے گا۔“ اماں کی بات سچ ہونے کے باوجود اسے منکوحہ نہیں ہوئی وہ ٹال گئی۔

اس واقعے کے بعد نجمہ زیادہ ابھمن کا کھانا کھاتی۔ البتہ اماں نے ضد پکڑ لی تھی ان کے خیال میں نجمہ کی بھتری اسی میں تھی کہ مہا کی شادی ہو جائے ورنہ جس قدر اس کے لیے وہ حساس ہو سکتی تھی اس سے غرابی ہی غرابی تھی۔ اسی نکلیں میں مہا کا زلزلہ آ گیا وہ ابھی تھکے بہروں سے ابھ اے پاس کر سکتی تھی۔ آج کل نجمہ نے اسے سلائی کے کام کی تربیت دینی شروع کر دی تھی۔ وہ بھی لیوں پر چپ کی مہر لگائے نظر لیں جھانے ماں کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

اماں کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی انہیں بیٹی اور دوسری کی فکر اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی۔ محروم کچھ کچھ نہیں تھیں۔ نجمہ بھی کچھ پرسکون تھی کیونکہ اس واقعے کے بعد مہا گھر سے باہر جاتی تھی اور نہ وہ لڑکا بھول کے بھی نجمہ کو گرا تھا۔ وہ کپڑے ہی کر دیتے جاتی، مگر کا سودا سلف لینے جاتی۔ لیکن پھر کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ گھر گزرنے والے دن کے بعد اس کے اندر اطمینان بھرنے لگا۔ جانے حالات سے سمجھتا نہ کر لیا تھا، سلائی، مگر کا کام کاج اور اماں کے پاس بیٹھ کر ان کی ناگہنیں دیکھنا، سردیانا، ہاتھیں کرنا اس کا معمول تھا۔ نجمہ کو پرسکون دیکھ کر اماں کو سکون سا آ گیا تھا۔ اب انہیں بڑھاپے کی کمزوری کے سوا کم ہی کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ نجمہ زندگی کی طرف کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔

وقت سر کا گیا مہا کو ایف اے کیے ہوئے ڈیڑھ سال بیت گیا۔ وہ ہنرمند درزن بن گئی تھی اس کے ہاتھ میں منگائی تھی۔ ذہن میں جدت تھی۔ خوبصورت کپڑے کی کچھیتی تو لوگ اس کا پتہ پا جیتے۔ نجمہ بہت خوش تھی، اس خوشی میں وہ بھول گئی تھی کہ مہا کی شادی بھی کر رہی ہے۔ مگر آج گوشت اور ہنری لے کر گھر پہنچی تو مگر میں اماں کی منہ بولی بینک کی بیٹی گفتگو مع ساس کے موجود تھیں۔ وہ تپاک سے ملی مہا نے چائے بنا کر پیش کی مگر اماں نے کھانے کے لیے بھی اصرار کیا۔ مہا نے اپنے سلیقے سے بہت جلدی کھانا بنالیا۔ وہ باہر کھانا بنا رہی تھی کہ اماں نے نجمہ سے بھی بلا پو پوٹھے اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ گفتگو نے اپنے بڑے بیٹے انور کے لیے اسے مانگ لیا تھا۔ بظاہر تو نجمہ نے خاموشی اختیار کی مگر مہاں کے جاتے

ہی وہ پھر سے خوفزدہ ہو گئی۔

”نجمہ! غریب آگہن میں بیٹی جلدی ڈھلتے سائے کی زد میں آ جاتی ہے، بیٹی کی محبت میں مت بھولو کہ اسے عمر بھر خاموشی سوال کرنا تم نہیں دیکھ سکو گی۔“

”مگر اماں؟“ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔

”مگر مگر کیا؟ بس سب وہم دور کر کے بیٹی کو سادگی سے رخصت کرنے کی تیاری کرو، دیکھتے بھالے لوگ بیٹی لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ برسر روزگار ہے۔“ اماں نے لمبی چوڑی تاویل پیش کی تو پھر پھڑا دے دل تو کھینچی میں دبا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سادگی سے تیاری ہو گئی، مہا کے چہرے پر گلاب مکمل اٹھے تھے۔ اماں کا زہر اس کی شادی کے لیے فروخت ہوا۔ سب ضرورت تیاری ہوئی نجمہ کو دوسوں مہرے دل کے ساتھ بیٹی کو رخصت کرنا پڑا۔ آگہن خالی ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ پہلی مرتبہ بہت خوش اور مطمئن ہو کر گہری نیند سوئی۔ منجانب بھر کا ہاتھ کیا، گھر میں پہلی بے ترتیب چیزوں کو سمیٹا، کوئی باقاعدہ مہمان نہ ہو گیا ہی نہیں کیا تھا، چند محلے دار تھے۔ لہذا آسانی سے گھر کی چیزیں ترتیب میں آ گئیں۔ وہ اماں کو لے کر دوسے میں شرکت کے لیے گئی۔ واپسی پر مہا اور انور کو ساتھ لے کر آئی۔ دل کھول کے آؤ بھگت کی۔ وہ دونوں اگلی صبح ہاتھ کر کے کوٹ گئے۔ مہا بہت خوش تھی۔ ایک شہر میں ہونے کی وجہ سے آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ احساس نجمہ کے لیے خوش کن تھا کیونکہ بیٹی سے زیادہ دن لے بغیر وہ نہیں نکلتی تھی۔ اب وہ خوش تھی اماں نے خوش دیکھ کر بتلایا۔

”دیکھا تم نے! کتنی خوش ہے ہماری مہا، بلا وجہ وہم اور خوف میں گہری رہتی تھیں۔“

”اماں! تم نہیں سمجھو گی، خوف اور ڈر کی صرف ایک صحت کی بات ہوئی ہے۔“

اب بھی میں اندر سے رنجیدہ اور پریشان ہوں۔ ”اس نے بولے سے ان کے بالوں میں تل کی بالٹ کرتے ہوئے کہا۔ شاید وہ جی ہی کہہ رہی تھی یا پھر ماں کی چھٹی حس کا بیان کبھی غلط ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس نے جس خوف کو گفت دی تھی وہ اس کا وہم تھا۔ جو شادی کے ٹھیک ساتویں مہینے گفتگو سے قحش میں بدل گیا تھا۔ وہ کندھے پر درد سے نجات کے لیے آؤ پوٹیکس لگا رہی تھی بلکہ اپنی دانست میں ڈاکٹری نسخے پر عمل کر رہی تھی حالانکہ کندھے میں درد کی چوٹ کا نتیجہ نہیں

تھا بلکہ اندرونی مسئلہ تھا جس کا علاج مستقل دوا اور مستقل آرام میں تھا۔ مگر وہ دونوں سے غفلت برت رہی تھی۔ اماں اسے کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ مغرب کی آذان کی آواز سنائی دی تو چپ ہو گئیں۔ اسے مشین کے سامنے بیٹھا دیکھ کر پھر کچھ کہنا ہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہو گئی..... نجر نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو مباحثت غم سے روٹی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ نجر بدحواسی اسے لیے چارپائی تک آئی۔ مگر وہ اپنے رپاد ہونے کا تذکرہ بھیجیں مار مار کے کر رہی تھی۔ اماں بھی پریشان ہو کر اس کے پاس آ گئیں نجر چند لمبے ساکت کمزری روٹی بکھتی مباحثہ کیجی رہی اور پھر مشین کے سامنے جا بیٹھی۔ اماں اس کی بے بسی پر پھٹ پڑیں۔

”تجھے بچی سے بھی زیادہ یہ مشین پیاری ہے، یہ پیہر ہی کھلتی رہنا۔“ ذرا دیر کو اس نے تیزی سے پیسے کو چلا پلا۔ مشین چلنے کے شور میں اپنے اندر کی آواز کو دیا یا اور پھر بیٹکی لگیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اماں! میں نے کہا تھا نا کہ پیہر گھوم کر واپس آتا ہے۔ کریم بخش کے ہاتھوں کا گھوما پیہر بھی تو آخر واپس آ گا ہی تھا۔ یہ مکافات کا خوف ہی تو میرا پاگل پن تھا۔ میں مباحثہ نہ بچا سکی۔ کاش! کریم بخش آ کر دیکھ سکتا۔“ مشین کی آواز میں مباحثہ کی سسکیاں غم ہو گئیں۔ اماں کی سمجھ میں نجر کی ہر بات آ گئی اور پہلی بار انھیں کچھ یاد آ یا مگر وہ لب نہ ہلا سکیں کیونکہ اس نے تیزی سے مشین چلا کر اس کے شور میں ہر آواز دبا دی تھی۔



شع باجی جیسی

”کرن اری او کرن!“ رضیہ نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہنچھلا کر آواز دی تو کرن بوسل کے جن کی طرح اس کے پاس آ پہنچی۔ رضیہ ہنڈیا بھونکتے ہوئے بھول گئی کہ کرن کو اس نے آواز دی تھی۔ کچھ بدوہ باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی رہی پھر پلٹنے لگی تو رضیہ کو یاد آیا۔

”کہاں چل دیں؟ بیٹھو آنا گوندھو۔ میرے تو کندھے میں بہت درد ہو رہا ہے۔“
”اب کس کو روٹی کھانی ہے؟ بلا وجہ آتا خیر ہوگا۔“ وہ اپنی ترنگ میں کہہ کر یہ سمجھ بیٹھی کہ وہ چھوٹے سے گھر میں ضرور پیدا ہوئی مگر بے افلاطون..... مگر رضیہ نے دو چھوڑ مار کے اسے یاد دلایا کہ وہ کھلندری بے خوف اور آٹھ جھاتیں پاس ہے بس.....

”تیرے بھائی کو روٹی کھانی ہے، بھول گئی شادی پر تو ٹو میں اور بھلو گئے تھے، راجہ

کام پر گیا ہوا تھا۔ جانے تیرا دھیان کہاں ہوتا ہے؟“

”ای! شع باجی کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا دیکھتے جاؤ۔“ خالی کتھڑ کی پہلیاں بجا بجا کر وہ آٹا کاٹنے کی کوشش میں ہوئی۔

”وہ ہے ہی بہت پیاری۔ قسمت کی بھی پیاری ہے۔“ رضیہ نے کچھ اس انداز میں سراہا کہ کرن کو صاف لگا کہ اسی کے اندر خاموش حریفیں گرلا رہی ہیں۔ اس کی شادی بھی تو رضیہ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ ”ای! اجیز کا سامان کتنا تھا اور سب چیزیں پتہ نہیں کہاں سے خریدی ہیں؟“ کرن نے دو روٹی آنے پر پوری قوت سے ٹکے بازیاں کرتے ہوئے کہا تو رضیہ بڑے تجل سے ہوئی۔

”بیٹا! حسین کے خشن کی، دولت مند کی دولت کی، بڑھ لکھے کے علم کی تعریف کیا

کرتی؟ تو اپنا ذہن صرف اکبر تک رکھا کر۔“

”میں برابری تو نہیں کر رہی، سب تو تعریف کر رہے تھے۔“ کرن نے منہ بنا کر آنے کی تھا لی رضیہ کی طرف سر کاٹی اور ہاتھ پٹیل کی پانی میں بچے پانی سے دھو کر باہر نکل گئی۔ رضیہ نے ہنر یا چہلے سے اتاری، بتو رکھا اور راجہ کے لیے روٹی بنانے لگی۔ منہ اندھیرے گھر سے ٹیکری کے لیے جانے والا راجہ مغرب کے بعد گھر میں گھستا تھا۔ اس کی وجہ سے تو شیخ کی رخصتی کے ساتھ ہی وہ بھی گھبت آپا سے اجازت لے کر آگئی تھیں۔ کھانا تو بہت بچا ہو گا۔ بہت کھانا انتظام تھا مگر ابھی رخصتی کی گھما گھمی تھی۔ کھانا وغیرہ تو بد میں دیکھنے کا مرحلہ تھا۔

گھر آ کر اس نے جلدی جلدی آٹو گھومی کاٹ کر چہلے پر چڑھا دی تھی۔ رضیہ کے لیے راجہ ہی سب کچھ تھا۔ گھر کا واحد کھیل، احسان رنگ ساز کے بعد ماں بڑی بہن اور چھوٹے بھائی بھلو کی کفالت دی کر رہا تھا۔ خود بھی ابھی بہت بڑا بیٹا ہوا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا تھا مگر بہت ذمہ دار رنجیدہ سا تھا۔ کرن اس سے بڑی تھی۔ صرف دو سال بڑی اور بھلا سے پورے چھ سال چھوٹا تھا۔ وہی اسکول جاتا تھا۔ سرکاری اسکول کی فیس کے ہی وہ متمثل تھے۔ رضیہ نے اپنی منہ بولی بہن کے بیٹے اکبر سے پچھلے سال ہی کرن کی معافی کی تھی۔ اس کی معافی کے ساتھ ہی رضیہ نے سوئی دھا کر سنبھال لیا تھا۔ وہ ابھی کڑھائی جاتی تھی۔ خاص کر چھوٹے بڑے شیشے کا کام وہ بے حد خوب صورت کرتی تھی۔ گھبت آپا سے بھی کڑھائی کی وجہ سے واقفیت ہوئی تھی۔ وہ اسے بہت سا کام ملنے پلٹنے والوں سے لے کر دیتی تھیں۔ گھر کے کام کا ج میں کرن اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ خود زیادہ وقت کڑھائی کے کام کو دیتی تھی۔

اکبر ایک سٹور پر ملازم تھا۔ اس کی اتنی تنخواہ تو نہیں تھی پر گھر ذاتی تھا اور باپ سرکاری اسکول کا چیر اسی تھا۔ اس لیے گزراوقات اچھی ہو رہی تھی۔ رشیدہ کو بلی پتی کی جیسے نقوش والی کرن بہت پسند تھی۔ اس لیے اس نے بڑے جاؤ سے معافی کی تھی۔ رضیہ کے گھر کے حالات سے رشیدہ بخوبی واقف تھی اس لیے اسے کسی قسم کا لالچ نہیں تھا۔ اکبر بھی شریف سلکھا ہوا لڑکا تھا۔ اسے کرن سے دلی لگاؤ ہو چکا تھا۔ ایک دو روز بعد وہ کچھ دیر کو ضرور آتا تھا۔ رضیہ مقتدر بھر خاطر تواضع کرتی پھر وہ کرن سے گپ شپ کرتا۔ کرن بھی کبھی شرماتا جاتا اور کبھی اس کے سامنے بدحواس ہو جاتی تو وہ خوب ہنساتا۔

”کرن! تیری ادا بھی زنا ہے۔ کبھی تو سات پردوں میں چھپ جاتی ہے اور کبھی

بوکھا کر کرکریں مارنے لگتی ہے۔“

”ایسے ہی.....“ وہ ناک چڑھا کر کہہ دیتی۔ ایسے ہی تو اس کا نیکہ کلام بن گیا تھا۔ اکبر جھٹ اس کی نقل اتارتا تو وہ مان جاتی۔

”تو پاگل ہے بالکل۔“ وہ چڑا ہوا کہہ کر چلا جاتا تو وہ ماں سے الجھنے لگتی۔

”میں پاگل ہوں کیا؟“ رضیہ کی سادگی سے اثبات میں سر ہلا دیتی تو وہ چیخنے لگتی۔

”ٹھیک ہے مجھے نہیں کرنی اکبر اعظم سے شادی وادی۔“

”اری بے وقوف اکبر اعظم کہاں اور خود رکھاں کہاں؟“ وہ مطلب نہ سمجھتی تو منہ بنا کر ماں کے پاس سے بھی چل دیتی کیونکہ اکبر اعظم کے ساتھ خود رکھاں کا تعلق اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آتا تھا۔ وہ تو جل بہن کے اکبر اعظم کہتی تھی۔

خاص کر جب وہ اسے چڑانے کو اپنی پرانی سی موٹر سائیکل زور شور سے لے کر گھر کے صحن میں آتا تو وہ بہت چڑتی۔ اس کی موٹر سائیکل میں ہزار ہا کیڑے نکالتی۔ بات اس کی بھی بچ جاتی تھی۔ اکبر کے اپنے اسے سینکڑے پیڑ موٹر سائیکل جب چار سال پہلے لے کر دی تھی تب اس کا نام پتہ کھائی دیتا تھا مگر اب تو وہ بے نام و پتہ کی عکاس تھی۔ صرف پیچھے نمبر پلیٹ کے کچھ نمبر دکھائی دیتے تھے۔ اس پر بھی وہ جان بوجھ کر اتارا اور کہتا.....

”کرن! ای موٹر سائیکل پر تجھے بیاہ کر لے جاؤں گا اور خوب سیر کر اؤں گا۔“ تو وہ کبھی شدید غصے میں آ جاتی اور کبھی ہنسنے لگتی۔ لیکن زیادہ تر وہ غصے میں ہی آ جاتی تھی۔

”ہونہ..... میں اس موٹر سائیکل پر بیٹھوں گی۔ شکل دھو لیجئے اکبر اعظم۔“

”تو بھی خوب ہے اکبر اعظم کہتی ہے اور اکبر اعظم کے بارے میں جانتی کچھ نہیں۔“ پگلی تیری تو سوچ کے پرکٹ جا نہیں گے۔ اس کی حیثیت کے آسمان پر اڑتے اڑتے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر چل دیتا اور وہ کئی دن سوڈ آف کرکتی۔

مگر آج جب سے شیخ کی شادی سے لوٹی تھی تب سے وہ اس کا دل ہی دل میں بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، چھوٹی چھوٹی حسرتیں، خواہشیں بے قرار کر رہی تھیں۔ شیخ کے بڑے لیے درحقیقت اپنے ارمانوں کی آڈیو کیسٹ اسے سنا جاتی تھی مگر وہ نہیں آیا۔ راجہ کھانا کھا کر خزانے لے رہا تھا۔ رضیہ نے ناک پر بینک رکھے سوئی دھا کر سنبھال رکھا تھا۔ بھلو اسکول کا کام کر رہا تھا۔ کیلی وہی دی دی کر رہی تھی۔ نفیر نی دی دی تھیں اور دل و دماغ دوڑاڑے کی

طرف مگر کچھ دیر بعد جوں ہی بیلو نے کام مکمل کیا تو رضیہ نے اسے کرے کا دروازہ بند کرنے کو کہا۔

”بیٹا! دروازہ بند کرلو۔ سردی بڑھ گئی ہے اور سو جاؤ۔“ بیلو نے ماں کے کہنے پر عمل کیا اور مجبوراً اسے بھی دی بند کر کے لیٹا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں ایک چھت تلے چار بندے گہری نیند کے حرے لے رہے تھے۔ ہر غم اور دکھ سے آزاد شاید اللہ تعالیٰ نے نیند بھی نعمت بنائی ہی اسی لیے ہے کہ اس کی آغوش میں چھپ کر انسان سب کچھ بھول جائے۔ اگلی صبح گھٹ آپا کا ملازم آیا اور رضیہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ شیخ سے چھوٹی حتیٰ طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اسے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ کرن کو ہوشیاری سے رہنے کا کمر لگائی۔ رلیہ تو کام پر جا چکا تھا۔ البتہ بیلو ابھی اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ رضیہ نے ناشتہ تو اس کا بنا رکھا تھا۔ ناشتہ کر کے وہ اسکول چلا گیا۔ کرن نے برتن سینے اور چچی خانہ صاف کیا۔ مگر کی صفائی کے لیے جھاڑو اٹھائی ہی تھی کہ اکبری موٹر سائیکل نے شور مچا دیا۔ اس نے جھاڑو دکھ کے دروازہ کھولا تو وہ موٹر سائیکل اندر لے آئی۔

”اُمی! گھر نہیں ہیں فوراً چلے جاؤ۔“

”مجھے تمہاری اُمی سے نہیں تم سے مطلب ہے۔“ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر گھر میں

پچھے چنگ پر بیٹھ گیا۔

”ہونہ۔ رات کیوں نہیں آئے؟“ اسے رات والی بات یاد آ گئی۔

”کیوں؟ رات کو کیا تھا؟“

”کل منشی باجی کی شادی میں گئے تھے۔ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ بس کیا بتاؤں؟“ وہ اکبر کی دہک و حسرت اور شک سے پلکیں جھپک جھپک کے بتاتی چلی گئی۔

”اس سے میرا کیا تعلق؟ جو میرے نہ آنے کی شکایت کی؟“ اس کے اٹلے سے جواب پر وہ خستہ انداز میں بولا۔

”ہے ناشی باجی بہت حسین ہیں لیکن ان کا لہجہ بہت خوب صورت تھا اور زیور بھی پتہ نہیں کتنا مہنگا ہوگا اور پورے پانچ گھنٹے بعد تیار ہو کر آئی تھیں۔“ وہ اس کی بات سمجھے بنا پھر اپنی ترنگ میں بولتی چلی گئی۔

”تو پھر مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو۔ میں کسی منشی باجی کو جانتا ہوں کیا؟“ اکبر نے

نوکا تو اسے واقعی شرمندگی ہوئی۔ وہ سوچ ہی تو کہہ رہا تھا پھر بھی اس کی سوئی وہ انجی ہوئی تھی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ منشی باجی حسین ہیں اس پر اچھے خوبصورت کپڑوں نے انہیں اور حسین بنا دیا۔ وہ خود زیادہ حسین ہیں یا شادی کا سوٹ۔“

”کرن! اتم پاگل ہو۔ تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیے ایک بات بتاؤں۔ جتنی خوب صورت کپڑے اور زیورات لکڑی کو بھی پہنا دو تو وہ بھی حسین لگتی ہے۔ یہ بزرگ کہتے ہیں۔“ اکبریہ نے تیزی سے کہا۔

”اور میں میں تو اچھی نہیں لگوں گی؟“ وہ معصومیت سے کچھ سوچتے ہوئے بولی تو وہ ہنس دیا اور شرارت سے کہا۔

”ظاہر ہے تو سانسوئی، عام سی لڑکی ہے۔ اکبر عام سال لڑکا ہے۔ جیسے جتنی کپڑے اور زیورات لے نہیں سکتا۔ اس لیے تو عام ہی لگے گی۔“

”تو کیا فائدہ دہن بنے گا؟“ وہ تقریاً رو دی۔

”پگلی! ہر آدمی کا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ بے کار حرمیں ہیں۔ انہیں دل میں پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ تجھے تو اس گھر سے نکل کر ایسے ہی گھر میں آنا ہے پھر کیا منشی باجی کی باتیں کرتا۔“ وہ عجیبہ ہو گیا۔

”تو خوب صورت کپڑے بھی نہیں بنوائے گا کیا؟“ اس نے پوچھا۔ ”خاؤں گا مگر اپنے خوبصورتی کے محدود معیار کے مطابق۔“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ ابھی گئی پھر اکبری لڑکی پر نظر ڈال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا مگر راستے میں وہ کرن کی معصوم خواہش کے متعلق سوچتا رہا۔

حتا کو شہید آسمان کا ایک ہوا تھا۔ دو دن سے اسپتال میں داخل تھی۔ شادی کے ہنگاموں میں طبیعت کی خرابی پر نہ گھٹ آپا توچہ دے سکیں اور نہ ان کے شوہر اس لیے اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ گھٹ آپا بہت پریشان تھیں۔ شیخ اور اس کے شوہر کی انگلیز کے لیے فلائیٹ تھی۔ حتیٰ کہ حالت تسخیر نہیں رہی تھی۔ مگر میں سامان پھیرا ہوا تھا جسے رضیہ نے ملازمین کے ساتھ مل کر کافی حد تک سیٹ دیا تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ کچھ دیر کے لیے گھر گئی تھی۔ کرن کو پکانے کے لیے گوشت سبزی دے کر ضروری دیا دیا دے کر پھر واپس چلی گئی مگر حتیٰ کی طبیعت سمجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گھٹ آپا بہت پریشان تھیں۔ ایک بیٹی انگلیز جا چکی تھی اور دوسری اسپتال کے بستر پر تھی۔ حتیٰ کہ

بتایا کہ اکبر کی اہلیا کو شادی کی تاریخ چاہیے۔ میں نے جمعہ کے دن آنے کو کہہ دیا ہے۔

”کیا؟ ایسے ہی کہہ دیا یوں بلاتے ہیں کیا؟“ وہ اچھل پڑی۔

”ایسے ہی کیا؟ اور کیسے بجاتے ہیں؟ ناگئیں اوپر سر نیچے کر کے بلاتے ہیں کیا.....؟“ رضیہ کو کچھ فضا آگیا۔

”گھر کی حالت تو دیکھ لیں، کیا ہے گھر میں؟ اور شادی ایسے ہوتی ہے۔“ وہ بولی۔

”دیکھ کر! اور جیسی ہے ایسا ہی ہے۔ ہاتھی کھوڑے تو لاؤ نہیں سکتے۔ رشیدہ کو سب معلوم ہے۔ اسے کچھ نہیں چاہیے۔“

”پھر میری ایسی بیک منگوں والی شادی مجھے نہیں کرنی۔“ اس نے جھلا کر کہا تو رضیہ کھتاؤ آگیا۔

”زبان حلق کے اندر رکھو۔ جو میں نے جمع کیا ہے۔ اسی میں شادی ہوگی نہ فرض لوں گی نہ کوئی بیک کسی سے مانگی۔“

”اور شیخ بائی کی شادی۔“

”کیا شیخ بائی شیخ بائی لگا رکھی ہے؟ شیخ بائی سے زیادہ شاندار شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔ تم اپنی چار دو دیکھ کر مبرا کرنا سیکو۔“

”ہونہ! شادی ہوتی ہے۔“ وہ منہ بسورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایک دو دن میں رضیہ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس نے جو کام کڑھائی کا لے رکھا تھا۔ وہ تین دن اور تین راتیں لگا کر مکمل کیا پھر وہ دے کر آئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاص صندوق کو کھولا جسے وہ ہمیشہ پہلے تھامی میں کھولا کرتی تھی۔ اسے کرن نے یا راجہ نے بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے؟ آج اس میں روپے نکال کر منگے تو اطمینان کی لہر دل میں اتر گئی۔ پورے پچیس ہزار ایک سو روپے اس کے پاس تھے۔ اس کے علاوہ دوسو نے کی چوڑیاں اور ایک انگوٹھی اس نے کرن کے لیے بپار بھیجی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا اور دوبارہ صندوق بند کر دیا۔

بھرات کو اکبر آیا تو اس وقت وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ رضیہ بیلو کے کپڑے سی رہی تھی۔ اکبر نے رضیہ کے پاس جا کر سلام کیا۔ اس نے خوش ہو کر دعائیں دیں پھر وہ باہر مہن میں اس کے پاس آگیا۔ وہ چپ چاپ کی گئی۔

یہ مرض پیدا آئی تھا۔ چوبیس سال سے اس کے ساتھ ہی تھا۔ میڈیسن اس کے ساتھ ہر وقت ہوتی تھیں۔ محبت آپا نے اس کا بھی رشتہ کر رکھا تھا۔ شادی کی تیاری بھی مکمل تھی۔ بس لڑکے کے باہر سے آنے کا انتظار تھا۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ شیخ اور حنا کی شادی اسٹے ہی کریں مگر خرم حنا کے حکمتیر کے ملک سے باہر ہونے کے باعث پہلے شیخ کی شادی کرنی پڑی۔ اب اسے شدید ایک کا سامنا تھا۔

اور رضیہ کو کمر کی بھی فکر تھی کہ کرن اکیلی ہے۔ لا اہالی سی ہے۔ حالات فی زمانہ خراب تھے۔ جوان بچی کو تنہا گھر چھوڑتے ہوئے ڈر لگتا تھا مگر محبت آپا کو مشکل میں تنہا چھوڑنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ تاہم کچھ دیر کے لیے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو محبت آپا روبرو۔ رضیہ! جوان بچی مانی کے سامنے یہ سہہ پڑی ہے۔ تم کچھ دیر کے لیے ہواؤ۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔ مگر قسمت کو محبت آپا پر رحم نہ آیا۔ رضیہ ابھی گھر پہنچی ہی تھی کہ کرن سے چائے بنوا کر کپ ہاتھ میں بکڑا ہی تھا کہ باہر کھڑے زوریاور نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ کرن نے بھاگ کر پوچھا تو وہ دور ہا تھا۔

”فون آیا ہے۔ ہماری چھوٹی مہم صاحب ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ تاہم صاحب چلی گئیں۔ میں جا رہا ہوں۔“

کرن نے بھاگ کر ماں کو بتایا تو رضیہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ گیا اور کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ لٹے قدموں باہر آئی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

بس پھر ہفتہ بھر رضیہ محبت آپا کے پاس رہی۔ مہمان رخصت ہو گئے تو اجازت طلب کی۔ انہوں نے ہنگامی پکوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

”رضیہ! میری خدمت کا کوئی بدل نہیں۔ میری حنا کے خواب اسٹور میں بند ہیں۔ وہ تعبیر بتانے کے لیے میں آؤں گی۔“ رضیہ کچھ ناگھجھ کی اور کمری دل کے ساتھ اندر آگئی۔

دکھ اور صحن کے باعث رضیہ کو بخار آنے لگیا۔ کرن نے خوب خدمت کی۔ وقت پر دوا دینا چاہئے، انڈا اہال کر دینا اسے یاد رہتا۔ اس وقت بھی وہ دلیہ بکھاری تھی کہ اکبر کی ای رضیدہ اور ابا آگئے۔ وہ دوپہر سیر کر کے انہیں رضیہ کے پاس لے آئی۔ رضیہ خوش ہو گئی۔ اسے چائے بنانے کا کہا۔ وہ فوراً باورچی خانے میں آگئی۔ بیلو سے بکٹ منگوائے چائے بنائی۔ بیلو کے ہاتھ ٹرے اندر بھیجی۔ کچھ دیر بعد مہمان طے گئے۔ وہ کمرے میں گئی تو رضیہ نے

”خیر ہے؟“

”کچھ نہیں“

”کچھ نہیں تو اس ’ایسے ہی‘ کا پیچھا چھوڑ دیا کرو“

”ہلو کیوں آئے ہو؟“

”ایسے ہی۔ اس نے نقل اتاری۔

”کل تو تمہاری ای ابا آرہے ہیں۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”مگر میں خوش نہیں ہوں۔“

”کیوں.....؟“ وہ چونکا۔

”شادی ایسی ہوتی ہے۔“

”شادی تو شادی ہوتی ہے۔ ایسے کیسے کی بیخ کہاں سے آگئی؟“

”شیخ باہی کی۔“

”خدا کے لیے یہ شیخ باہی کی کہانی بند کر دو۔ اکبر اور کرن کی بات کر لیں۔“

”کیوں میں انسان نہیں ہوں۔ کیا میرے دل میں ارمان نہیں ہیں؟“ وہ چلائی تو

اکبر کو ٹھہرا گیا۔

”شادی خوشی، اعتماد اور مضبوط تعلق کا نام ہے۔ تم بے کار چیزوں سے اسے شرط کر

رہی ہو۔“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا تو وہ رودی۔ اس کے خیال میں اکبر نے اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

اگلا دن جمعہ تھا۔ رضیہ نے کھانے کے لیے چاول گوشت دہی مصالحے سب کچھ راجہ

سے منگوائے۔ خود باورچی خانے میں گھس کے کبیر پکانے کی تیاری کرنے لگی۔ راجہ کی جھوٹ

چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے اس روز باہر کے سب کام دہی کرتا تھا۔ آج تو وہ بہت خوش تھا کہ اس

کی پیاری بہن کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی۔

بعد نماز جمعہ رشیدہ اور کریم وین مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئے۔ سب سے پہلے رضیہ

نے کھانا لگایا۔ کھانے کے بعد وہ مبارک ساعت آئی جس میں اس کی اور اکبر کی شادی کی تاریخ

طے ہوئی۔ اگلے مہینے کی گیارہ تاریخ رکھی گئی۔ مٹھائی سے سب نے منہ میٹھا کیا۔ اس کے سر پر

ہاتھ رکھ کے دعائیں دیں اور رشیدہ نے ہزار کا نوٹ اس کی منگی میں دیا پایا۔

شام گئے وہ روانہ ہوئے تو رضیہ گرم جوشی سے ضروری سامان اور ضروری کاموں کی

فہرست راجہ سے بخوانے لگی۔ وہ دور بیٹھی کر جھٹی رہی۔ اگلی صبح رضیہ نے لسٹ کے مطابق پیسے

لیے اور بازار چلی گئی۔ ہلو کو ساتھ لے گئی۔ راجہ کام پر جا چکا تھا۔ وہ اکیلی تھی کہ اکبر آگیا۔

”اب کیوں آئے ہو؟“

”ای نے تمہارے ناپ کے کپڑے منگوائے ہیں۔“ وہ بولا۔

”امی آکر دوں گی.....“

”مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم دے دو۔“

”عام سے کپڑے بنانے کے لیے۔“

”کرن! میرے جذبوں کا یوں مذاق مت اڑاؤ اور ہاں تمہیں شادی کا جو جواز پسند

ہو میرے ساتھ چل کر پسند کرو۔ اگر جوڑے کی خوب صورتی اور قیمت سے ہی دلہن اچھی لگتی

ہے تو میں تمہیں انا کیلے لے جاؤں گا۔ بڑی سی دکان پر۔“ اکبر نے کچھ بھید کی اور آخر میں نرمی

لاتے ہوئے کہا تو وہ پھول کی مانند گل اٹھی۔

”ج“

”ہاں کل شام کو تیار رہتا میں لے جاؤں گا۔“

”اور ای.....“ وہ بھی بھی بولی۔

”کچھ کہہ دوں گا۔“ اس نے تسلی دی۔

”تم سچے اچھے ہو۔“ وہ چھوٹی سی بیچی کی طرح خوش ہو کر بولی۔ اکبر کو اس کی

مصعوبیت پر بہت غبار آیا۔ وہ جھٹ اندر گئی اور اپنا ایک جوتا کپڑوں کا لے آئی۔ اسے پکڑا لیا تو

وہ دن سے موٹر سائیکل نکال لے گیا اور وہ کافی دیر خوشی کے ہنڈولے میں بھولتی رہی کہ

چوہے پر رکھا دوہا ابل ابل کر نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

رضیہ نے ضروری ضروری کچھ برتن، کچھ کپڑے اور بہتر کی چادریں وغیرہ خریدیں

جب گھر لے کر آئی تو کرن نے برا منہ سامنا کر کہا۔

”ایسا سامان تو جینکوں میں رہنے والے بھی نہیں دیتے۔“ رضیہ نے گھور کر اسے

دیکھا اور نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھی۔

”امی تم نے شیخ باہی کا سامان دیکھا تھا؟“

”کیا؟ اتنی جلدی..... تم نے ذکر تک نہیں کیا۔“

”بس جی گھر کی بات ہے۔ ایسا ہی گھر ہے۔ سادگی سے فرض ادا کرتا ہے۔ میں آج کل میں آنے کا سوچ رہی تھی۔“ رضیہ نے کہا۔

”اللہ مبارک کرے۔ میں نے حنا کے بعد تم سے کچھ کہا تھا یاد ہے۔“

”نہیں۔ یاد نہیں آپ بتا دیں۔“ رضیہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”خیر حنا کی شادی کا سامان اسنو میں بند ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ سامان کرن کو دے دیا جائے۔ میری بیٹی نہ رہی پھر اس کا سامان کیا کر دوں گی؟“ وہ حد درجہ دھکی لہجے میں بولیں۔ اس سے کرن چائے لے کر آچکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلماٹھے لگیوں پر مسکان آگئی۔ محبت آپانے اس کے دل کی بات کی تھی۔ وہ ماں کی طرف دیکھنے لگی کہ وہ کیا کہتی ہیں؟

”اللہ آپ کو خوش رکھے۔ حنائیٹی کے درجہات بلند کرے مگر کرن کے لیے تو میں نے سب کچھ بنالیا ہے۔“ رضیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر صاف انکار کر دیا۔ کرن کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ اٹھ اٹھ کر چلی گئی۔

”بھریجی جو کچھ چاہا تو وہ۔ میں بھجوا دیتی ہوں۔ جہیز کے سامان کے لیے تو جتنا ہو اتنا ہی کم ہوتا ہے۔“ محبت آپانے کرن کے چہرے کی کہانی پڑھ لی تھی۔

”مگر جہیز ماں باپ کے بھتیجوں کی نشانی ہوتا ہے۔ وہ جتنا بھی ہواں کی محبت اور محنت سے بنے۔ ماگ کر کیا جھگڑا کر جہیز دینے سے بہتر ہے کہ نہ دیا جائے“ رضیہ نے دھیرے دھیرے کہہ کر انہیں دوسرے لفظوں میں منع کر دیا۔ وہ چپ ہو گئیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ کرن نے ماں سے کوئی بات نہیں کی جب بھی وہ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔

”تمہیں اچھا نہیں لگتا چاہیے کہ تم جہیز دیکھ کر یہ سوچتی رہو کہ یہ حنا بانی کے جہیز کا سامان ہے جو میری ماں نے مجھے دیا ہے۔ تمہیں غلط رہے گی جب کہ ماں کی دی ہوئی معمولی سی چیز بھی تمہیں حقیقی خوشی کا احساس دلانے لگی۔“ ہمیشہ کی طرح وہ چپ ہو گئی اور رضیہ کام میں لگ گئی۔

شام کو اکبر آیا۔ اس نے رضیہ سے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ شادی کا جوڑا پسند کرانے کے لیے کرن کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ رضیہ نے چند لمبے اکبر کی طرف دیکھا پھر اس کی

”ہاں مگر لچائی ہوئی حسرت زدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔“ رضیہ نے کرا کر آواز میں جواب دیا اور ڈھیر ساری برف اس کے احساسات پر گرادی۔ وہ پاؤں بچتی ہوئی باہر چلی گئی۔

پھر رضیہ نے اس کی طرف سے کان بند کر لیے۔ حسب توقع بہت ضروری اشیا خرید کر لاتی رہی۔ اس پر بھی کرن کو شکایت تھی۔ جس وقت وہ کسی کا دوپٹہ کاڑھ رہی تھی تو وہ سانسے اٹبھی۔

”امی! میں تمہاری سبکی بیٹی ہوں۔ مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے کیا کچھ نہیں کرتیں۔“

”کیا کروں؟ چوریاں کروں..... ڈاکے ڈالوں..... لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں.....؟ جہیز کے نام پر خودداری بیلام کروں؟ غربت کی چادر میں بے عزتی کے بیوہ میں سے آج تک کتنے نہیں دیے۔ تم کسی بھی بیٹی جو ماں اور بھائی کو قرض کی سولی پر چڑھانا چاہتی ہو.....؟“ رضیہ نے خوب گھن گرج کے ساتھ کہا تو وہ آنکھیں بھر لائی تب ایک ماں دل مسوس کر رہ گئی۔

”بیٹا! جہیز کے سامان سے عمر نہیں گزرتی۔ اچھی قسمت کی دعا کیا کرو بس جو ملے اسے خالص سونا سمجھ کے قبول کر۔ پھر خوشی ملے گی۔“ اسنے سینے سے لگا کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کے آنکھیں صاف کرتی ہوئی باور چنی خانے کی طرف چلی گئی۔

اس بات کا تھوڑا بہت اثر اس کے ذہن پر ہوا۔ چپ ہو گئی، شنبے بولنے لگی۔ ویسے بھی شادی کے دن اڑے چلے آ رہے تھے رضیہ نے اس کے لیے بھی دو خوب صورت کڑھائی والے جوڑے تیار کیے۔ تھوڑا سا کام باقی تھا کہ محبت آپا آگئیں۔ وہ تپاک سے ملیں۔ انہیں بہت پیار سے کمرے میں بٹھایا کرن کو چائے بنانے کو کہا۔ محبت آپا خوب صورت جوڑا دیکھ کر پوچھ بیٹھیں۔

”یہ کس کا ہے؟“

”کرن کے لیے بنایا ہے۔ اچھا ہے نا؟“ اس نے ہزار ہا خوشی کے ساتھ پوچھا۔

”بہت اچھا ہے۔“ محبت آپانے کہا۔

”کرن کی شادی قریب آگئی ہے۔ میں بہت مصروف تھی آئی نہیں سکی۔“ رضیہ نے

بتایا تو وہ حیرت سے بولیں۔

کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اکبر چل ساہوکر سیکڑ میوں کو دیکھنے لگا جو اس وقت مسکرا رہے تھے۔“

”ہاں۔ اس سے بھی خوبصورت۔ اب جاؤ جا کر پڑے تبدیل کرو۔“ وہ دے دے غصے سے بولا تو وہ واپس ٹرائی روم میں گئی۔ کچھ دیر بعد سر مٹی چادر میں لپیٹی باہر آئی تو اکبر تاریل ہو چکا تھا۔ اس نے سیکڑ میں کو کہا کہ اس کی قیمت بتا دیجیے۔

”جی نہیں ہزار۔“ سیکڑ میں نے اکبر کو چونکنے پر مجبور کر دیا جب تک جانے والا ہاتھ وہیں رک گیا کیونکہ اس کی جیب میں تو فقط نو ہزار روپے تھے۔ اس کے چہرے پر معذوری سی دیکھ کر سیکڑ میں اپنی تجربہ کاری کے باعث سمجھ گیا کہ وہ قوت خرید نہیں رکھتا۔ اس لیے اس نے لباس واپس تھہر کر ڈے میں ڈال رکھا۔ اکبر کو سیکڑ میں کی حرکت میوہ سی مگر بات یہ بھی سچ تھی کہ وہ قوت خرید نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں آٹھ نو ہزار سے زیادہ خرید نہیں تھا۔

”یہ میں دو دن تک آکر لے جاؤں گا۔ یہ نو ہزار ایڈوانس رکھ لو۔“ اکبر نے پورے نو ہزار سیکڑ میں کی طرف بڑھائے تو اس نے رسید دی اور وہ ہفتی مسکرائی کرن کو لے کر واپس آ گیا لیکن اسے دروازے پر ہی چھوڑ کے چلا گیا۔ رضیہ نے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ کوٹھی کوٹھی سی سب کچھ بتاتی تھی۔ رضیہ نے اس آنکھوں میں اٹھائے غبار کو اور حد درجہ خوشی کے عکس کو دیکھ کر فقط اتنا کہا۔

”خواہش کا دوسرا نام حرص ہے اور یہ لا اعلان مرض ہے۔ تم نے شادی سے پہلے اپنی ذات اکبر کے سامنے کیوں کھول کے دکھائی؟“

”کیا مطلب؟“ ”وہ منہ بنا کر بولی۔“

”نیکوئی نہیں اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے آمین۔“

رضیہ نے کافی گہری تنبیہ کی کے ساتھ اسے دعا دی اور پیشانی چوم لی تو وہ خوش ہو گئی۔ مگر رضیہ اندر سے چپ ہو گئی۔ اسے کرن کا عروسی جوڑے کے لیے اکبر سے فرمائش کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ پیدا ہوتے ہی جو تیرے اس کو ملی تھی وہ اس سے ناواقف کیوں رہ گئی؟ یہ سوال رضیہ کے دماغ میں گھس گیا۔ مگر کس کو بتائی؟

بس دل میں دوسرے لیے شادی کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ شادی میں اب دن ہی کتنے باقی رہ گئے تھے۔ دو دن بعد مایوں مہندی تھی۔ اس کے مطابق وہ اور رجبہ انتظامات مکمل

نگاہوں کا مطلب سمجھ کر جانے کی اجازت دے دی۔ کرن کی حالت دیدنی تھی۔ چہرے پر گلاب کھل اٹھے تھے۔ سانولا رنگ دیکھنے لگا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سچ وہ اہم دن کے لیے خاص پکڑوں کے انتخاب کے لیے جاری ہے۔ سر مٹی چادر میں خود کو لپیٹ کر اکبر کے ساتھ چکی بار موٹر سائیکل پر بیٹھنے سے زیادہ عروسی جوڑے کی پسند کا احساس اسے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

سارے راستے اکبر اس کے چہرے کی دیک وائیں ہاتھ کے شیشے میں دیکتا اور مسکراتا رہا۔ اس کی خاطر اس کو کس طرح راضی کر کے وہ بقول ان کے ٹوکھا کام کرنے جا رہا تھا۔ اپنی اننگلی میں بیچ کر اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ کس دکان میں اسے لے کر جائے۔ ہر دکان میں عروسی لباس اپنی جگہ دھکا رہے تھے۔ کچھ دیر جائزہ لینے کے بعد کرن کی مرضی سے اس نے ایک بڑی سی دکان کے سامنے موٹر سائیکل روکی۔ کرن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بلا وجہ ہی خرابانے لگی۔ دکان میں چاروں طرف ڈیسوں پر سجے عروسی لٹیکے اسے پریشان کر رہے تھے۔ کہ کون سا لہنگا کون سا ساغرہہ دیکھے۔ سیکڑ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں وہ تمام عروسی جوڑے کھول کھول کر اس کے سامنے ڈھیر لگا دیے۔ وہ ایک ایک کو ہاتھوں سے چھو چھو کے دیکھتی پھر خوشی سے اکبر کو دکھاتی۔ وہ اس کی خوشی میں خوش تھا۔ وہ اس سے رائے لیتی تو وہ کہہ دیتا۔

”جو تمہیں پسند ہے بتاؤ۔“

کافی شش و شج کے بعد اسے اور بج گولڈن کسٹراس والا لہنگا سیٹ پسند آیا۔ سیکڑ میں نے غمگینا سانس لیا۔ جلدی سے اسے ٹرائی روم میں لباس سمیت بھیج دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لباس پہن کر بالکل دلہن کے انداز میں باہر آ گئی تو تمام سیکڑ میں دکان دار اور اکبر نفقت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ سیکڑ میں اور مالک دکان کی کاروباری زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی لباس پہن کر باہر ایسی طرح سب کے سامنے آ کر داد چاہے۔ اکبر نے جلدی سے قریب جا کر تنبیہ کی مگر وہ اس وقت عالم شوق میں تھی۔ اس کی تنبیہ کا مطلب نہ سمجھی تو اکبر کو کہنا پڑا۔

”ٹھیک ہے اچھا ہے۔ جاؤ بدل کر آؤ۔“

”میں اس لباس میں مٹی جی جی جی دیکھ لوں گی نا۔“ اس نے محوم محوم

”ہائے تم کتنے اچھے ہو.....“ وہ خوشی سے تقریباً اچھل پڑی۔

”یہ یو یہ وہی جوڑا ہے جب بھی وہیں ہوگی تو بالکل شیخ باہی جیسی وہیں لگو گی۔“ وہ ایک اسے پکڑا کر دیر سے بولا۔ وہ انجانے میں مسکرا کر کہہ گئی۔

”یہ اس وقت بتانا جب مزہ دیکھو گے.....“

”اس وقت سے پہلے ہی میرے سینے نے مجھے گردی رکھ لیا ہے۔ میری قیمت تمہاری پسند کے جوڑے سے بھی کم نکلی.....“ وہ انتہائی اجنبی لہجے میں کہہ کر موٹر سائیکل نکال لے گیا۔

پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ ہاتھ میں پکڑا جوڑا اس کے قدموں میں آگرا تھا۔



کر چکے تھے۔ غریبوں کی شادی میں دیے بھی گئے چنے غریب مہمان ہی آتے ہیں۔ دوسرے شہروں سے کسی کو نہیں بلایا تھا۔ شاید سردی تھی۔ ایک کرے کے گھر میں مہمان بھرنا بڑا مسئلہ تھا اور دیے بھی اس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لہذا محلے کے چند گھروں کو شادی میں شرکت کی دعوت دی یا پھر عہد آپا اور ان کے شوہر کو رضیہ بطور خاص شرکت کے لیے کہہ آئی تھی۔ اس موقع پر بھی نگہت آئے اس کو دے دے لفظوں میں سامان کی پیش کش کی جسے اس نے نیلے سے مسرور کیا یہ کہہ کر۔

”نگہت آپا! ناہ سامان کے ساتھ نہیں انسانوں کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ میں نے جو بھی بنایا ہے وہ اپنی محبت اور محنت سے بنایا ہے۔“ نگہت آپا خاموش ہو گئیں۔ وہ واپس لوٹ آئی۔

شام ڈھل رہی تھی جب رضیہ گھر پہنچی۔ کرن روٹی پکا رہی تھی۔ راجہ آچکا تھا..... اس وقت اکبری کر موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ شادی میں دو دن رہ گئے تھے اور اکبری کا اب آنا رضیہ کو کچھ مناسب نہیں لگا لیکن پھر بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ خود اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ موٹر سائیکل اندر لے آیا۔ ”میں میں بھگی سے روٹی تھی۔ رضیہ نے اسے کرے میں آنے کو کہا مگر وہ وہیں رہنے کا کہہ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کرن باورچی خانے میں تھی۔ شرم آئے آئی تو باہر نہ لگی حالاں کہ وہ اسی سے ملنے آیا تھا۔ رضیہ کو اکبری کے چہرے پر پھیلی خاموشی حیرت میں مبتلا کر گئی۔ وہ تو ہمیشہ ہنستا مسکراتا ہوا آتا تھا۔ آتے ہی کرن کرن کی آواز میں لگتا تھا مگر آج اس کے اظہار میں ملال کے موسموں کی اداسی شامل تھی یا پھر اس کے احساس کی غنڈک..... رضیہ نے کچھ نا سمجھ کر کرن کو آواز دے کر باورچی خانے سے بلا لیا اور خود دانستہ کمرے میں چلی گئی۔

کرن کے قدم لجاجت سے لڑکھڑا رہے تھے۔ چلیں بارہیا سے چلی ہوئی تھیں۔ لیوں پر کپکانی مسکراہٹ تھی۔ شادی سے دو دن پہلے اس کا شریک سفر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اکبری کیوں آیا ہے؟ موٹر سائیکل کے دائیں ہاتھ کے ہینڈل سے جھولتا بڑا سا شاپر دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھڑک گیا۔

”تم شادی کا جوڑا لائے ہو ناں؟“

”ہاں“

کے جا۔“ جمولی میں سے شہزادی کو نکالتے ہوئے سانولی نے کہا تو وہ سینہ پیٹ کر چارپائی سے اٹھا۔ ”کیا؟ اسی ترادماگ کھراب ہو گیا کیا؟ یا جاؤں اور تو گھبرا کھاٹ توڑے گی دنیا بھر کی جتنا نیاں کام کریں، تو گھٹی میم صاحب ہے کیا؟“

”دیکھ رانگھن! میں نے تجھے بتادیا، میں کپڑا بیچنے کو نہیں جاؤں گی مجھے کھوپ آوے ہے، کیا تجھے میرا جڑا بھی کھیاں نہیں۔“ ڈیر سارا خوف سانولی کی سرخی کجرا دی آنکھوں سے نکل کر اس کے سونے ریشاردوں پر پھیل گیا۔ شاید اس خوف کا اثر تھا کہ کندھے سے گلی شہزادی بھی بالکل چپ ہو گئی تھی۔

”ری کاٹنے کا کھوپ، کالونیاں ماعلوں جیسے گھر ہوویں، وہاں کاٹنے کا کھوپ؟ اور تو رانگھن کی جتنی ہے تجھے کیوں کھوپ آنے لگا؟“ رانگھن نے فخر سے جھاتی پھلا کر اپنی بڑی بڑی گھٹی مونچھوں کو مڑتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ شہر کا سب سے بڑا دادا گیر ہو۔

”اناں بڑی بڑی گلو نیوں میں، بڑے بڑے گھراں میں ہماری ناجو کھو گئی، تجھے ناجو بھی یاد نہیں رہی رے۔۔۔۔۔ آج سنے اوں کی لاش بھی نہ ملی۔ جانے جہن کھائی یا آسمان نگل گیا۔ بس میں نہ جاؤں گی، تو کام ہے، چاہ میں گھبرا شہزادی کئے رہوں گی؟“ اس نے بڑے امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

”واہ بھئی! کیا کہنے ترے؟ تو تو گھٹی مسورہ باز ہو گئی، دیکھ سانولی! بھول وکت جانے نہ کر، پورے پانچ ہزار مال اٹھایا ہے۔ کل یہ پیسے اتارے ہیں چل سا بساں جا“ اس نے ایسے کہا جیسے بچے کو بھلاتے ہیں۔

”تو جانا ایں ادھار مال مرے واسطے لایا تھا۔“ وہ انتہائی سادگی سے کہہ کر شہزادی کو لیے لیے پھر سے چلے گئے کی طرف آگئی، ساجن کام پہ جانے کے لیے تیار ہو آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر رانگھن نے زور سے کہا۔

”اؤئے ساجن! کام پہ جاتے ہوئے اپنی بھابی کو ساتھ لے جائیو، نوی گلو نی جاوے گی۔“

”کہہ دیا نا! کو امانا نہ جاؤں اتی دور۔“ ساجن سے پہلے سانولی نے ہاتھ بچا کر اسے کورا سا جواب دے دیا تو رانگھن دوڑ کر صحن میں پڑے ڈنڈے کی طرف بڑھا اور اٹھا کر سانولی پر ٹوٹ پڑا۔ وہ بچاؤ میں ہاتھوں کی مدد لینے کے باوجود ناکام ہو گئی ہائے ہائے

مول بن مول

خلق خدا جاگ گئی تھی۔۔۔۔۔ سب اپنے اپنے کام کاج پر جانے کی تیاری کر رہے تھے مگر وہ بانسری کی تان میں جانے کہاں کھویا تھا کہ لکڑی کی جمبول کھاتی میز پر رکھا جائے گا پیالہ کب کا برف کے پانی میں بدل گیا تھا۔ دور دراز قافلے پر تو بے روٹی ڈالٹی، سانولی نے ماتھے پر ہزار ہا غلٹیں ڈال کر اسے کئی بار دیکھا مگر وہ تو بانسری ہوتوں سے لگائے، آنکھیں میچے کھیں اور نکلا ہوا تھا۔۔۔۔۔

ایسے میں بھلا کیا رانگھن کی چارپائی کی بچی سے بندھی جمولی میں لپٹی شہزادی نے، جو کچھ دیر پہلے تک پر سکون سوئی ہوئی تھی مگر یکایک زور زور سے روئے گئی تو سانولی کے لیوں پر شریری سکرا ہٹ آگئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ اب تو رانگھن کو بانسری رکھنی پڑے گی۔ مگر وہ تو آگ گولہ ہو گیا اور زور سے چلا یا۔

”ہمارا دفعہ تجھے سمجھایا کہ ایں کی جمولی دور کھاٹ کر کے باہر جا کر بھر تجھے تو جی آوے ہے۔“ رخ مڑ کر وہ اسی سے مخاطب تھا۔

”تیری اس بانسری میں فرق پڑ گیا، تو اس کا باب لاگے ہے، جرا گو مالے لے ایں میری سوتن کو دور رکھ دے۔“ سانولی بھی بھری بھری تھی فوراً چڑھائی کر دی، وہ بانسری کو اپنی سوتن کہتی تھی۔

”جناوہ جہان نہ چلا جائیں کو دور لے جا اور ہاں اتنا دخت ہو گیا تو اب مگر کام پہ نہیں گئی۔ دن چڑھ آیا ابھی چو لھے تو بے ہامھی ہوئی اسے۔“ وہ آنکھیں نکال کر زور سے بولا تو سانولی کو پتہ لگ گئے۔

”کو ا میں نہ جاؤں، تجھے کام پر جانا ہے ایں بانسرسری کو چھوڑ اور اللہ کا نام لے

کرنے لگی۔

”بہت جہاں چلنے لگی ہے تیرا باپ بھی کام پر جاوے گا یہ قریب اترتا ہے کون اتارے گا؟“ رانجنھن ڈنڈے پر سانا تاہو ازور زور سے بول بھی رہا تھا۔ جب اس کا تشدد حد سے بڑھ گیا تو ساجن کو اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کو روکنا پڑا۔

”بس کر! کیسے جانوروں کی طرح یوں پیٹ رہا ہے ٹھیک تو کہہ رہی ہے بھاجائی، نوی کلونی تھکی ڈوراے، یہ نسخی سی شہزادی کس کئے چھوڑ کے جاوے گی؟“ ساجن نے ڈنڈا چین کر دھڑکھڑکایا، سانولی سسکیاں بھر نے لگی۔

”اب تو ہاتھی بن گیا نا پوچھوں باجھ ہمارا قرا کیسے اتاروں گا؟“

”یا تو پہلے سوچن کی بات تھی، اب تو آپ کام پہ چلا جا۔“ ساجن نے بڑے بھائی کی عقل ہارنگاہوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور چولے کے پاس بیٹھ کر روٹی کے نوالے چائے میں ڈبو کر کھانے لگا۔

”سانولی! کان کھول کر سن لے کام پہ تو جاوے گی، اب دیر نہ کر کھڑی ہو لے، ماجنا تیاں میں کپڑا اچھن نہیں پاسکتا۔“

”ہاؤ تو اس طیل جرن کے ساتھ آکرہ کسلین کو جاوے گا۔“ وہ دہائی دے کر بولی۔

”پھر نجاب چلائی، چپ ہو جا اور کھڑی اٹھا پیسے پورے کر کے آئیو، مال نہ بیچ۔“ وہ کچھ نرمی لاتے ہوئے بولا تو سانولی گر لانے لگی۔

”دیکھ رانجنھن! امیر اول کا بیچے ہے، ناجو خیر آوے ہے، رے تو کیا مارا مرد ہے، تجھے جرابھی بھکر نہیں۔“

”ری! تو کا ہے کو بھکر کرے ہے ناجو کی، چھوڑ جانے کھو کہیں بھائی یا کوئی لے گیا۔“ روج روج ایسا نہیں ہووے۔ ”وہ اپنی ترنگ میں کہہ گیا جب کہ ناجو کے بارے میں اس کا نظریہ جملہ ساجن کے دل میں برجھی کی طرح کھب گیا۔ اُس نے زہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا اور غرا یا۔

”کھدا کھوپ ہی کر لیا کہ بھرا! وہ مصدوم ہی ناجو تھے ایسی لگتی تھی، داتو کچڑ میں کھلا پھول تھی۔“ اُس کے لہجے میں جو غم و غصہ سٹ آیا تھا اُس پر رانجنھن لہجے کو بھلایا، مگر ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا۔

”تو آٹھ جا، کیوں پھسا کر اوے ہے؟“

”جا، جا کے آکرہ کھیل! آج ناجی ہوں، ٹو کھو دگر ج ہے، ماری سہادی کا دھیان رکھو۔“ سانولی نے بھراے ہوئے لہجے میں کہا اور تیار ہونے چل دی۔ ساجن نے اپنی جگہ پر مسکراتے ہوئے بھائی کو دیکھا اور خوارت سے اُسٹھ کر دواڑے سے باہر نکل گیا، کچھ دیر میں وہ تیار ہو کے باہر آئی تو وہ بہت ہی مکاری سے مسکرا کر بولا۔

”واہ بھئی! کیا کامت بن کے نکلی ہے، دیکھ بڑا دیہان رکھو، تو رانجنھن کی زال ہے۔“

”ہا! جانو! تیری مکاریاں! اس واسطے تو نکلیاں میں دیکھے کھان کو بھیج رہا ہے۔“

سانولی نے ابرو چڑھا کر تیزی سے کہا اور بڑی سی گھڑی کی طرف بڑھی۔ وہ ہمدرد بن کے آگے بڑھا اور گھڑی اٹھانے میں مددگار بننے لگا تو وہ زور سے چلائی۔

”جا! آکرہ کم، چیاوہ ہم دری نہ دکھا تو جا مل کھد گر ج ہے۔ دھیان سے سن لے مری سہادی کا کھیل رکھو، رونے نہ دیو۔“ اُس نے جیسے تیسے اپنے ہنچیری جیسے جسم کو جھکا کر اپنے پتلے بازوؤں کی طاقت کو آزمائش میں ڈالا اور گھڑی سر پر رکھی، ایسا کرتے ہوئے دوبارہ لہرائی مگر تھوڑا وزن سنبھال لیا، رانجنھن نے مسکرا کر دیکھا وہ گھور کر کھڑکھڑاتے کھڑکی کے نیچے میز سے دروازے سے باہر نکل گئی، رانجنھن نے دونوں بازو اوپر کی طرف اٹھا کر مہر پور اٹھرائی لی اور چولے کے پاس بیٹھ کر چار پٹھا کھانے لگا۔

آج اس کا سامانی پر وہ بہت خوش محسوس کر رہا تھا، ایک سال سے وہ اسی سوچ بچار میں تھا کہ سانولی کو دوبارہ کپڑا پہنچے پر کیسے راضی کرے۔ ناجو کے ساتھ وہ تین چار سال سے پھیری پر جاتی تھی۔ مگر میں وہ جج جین کی بارسری بجاتا تھا۔ اُس کی کمائی پر آکرہ کھلنا، اپنے جگری دوست جیون کے ساتھ ظلم دیکھنے، ہر سکر دیکھنے اور کھانے پینے کا شغل کرتا تھا، مگر گزشتہ سال چاچی بھائی کی بیٹی ناجو اکیلی پھیری پر گئی اور واپس نہ آئی، سانولی شہزادی کی پیدائش کی وجہ سے نہ جا سکی تھی۔ یوں صبح سے شام اور شام سے پھر صبح ہو گئی۔ چاچی بھائی سر جینتی، جین کرتی بنانے کے لیے آئی تو وہ کچھ بکڑ کے رگھی، ساجن روٹی چھوڑ کے باہر بھاگا، رانجنھن اُس وقت بھی جیسے حس بنا بارسری بجاتا رہا۔ سانولی نے پریشانی سے نگار تو چلا کے بولا۔

”امی! کیا کروں، ما کے ساتھ گئی تھی، آجاوے گی سسری کہاں جاوے گی؟“

سانولی کے دل پر گھونسا پڑا، نسخی شہزادی کو کتنہ مے سے لگے کا اٹھی تاکہ چاچی بھائی کا

تلی دینے جانے پر وہ راستے کا بھاری پتھر بن گیا۔

”بیٹھ جا چپ کر کے، ساجن گیا ہے وضو لے گا، آؤں کی ہون والی اے، جمن میں سے بھی نکال لاؤں گا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

مگر ساجن رات گئے لوٹا، وہ بھی شکستہ ناکام، اس کے پیروں میں آبلے پڑے تھے، بالوں میں گرد پھنسی تھی کپڑے میلے جکت ہو چکے تھے، اُسے اس طرح دیکھ کر سانولی پریشان ہو گئی، وہ چھوٹے سے بچے کی طرح بیٹھ کے رو نہ لگا۔

”بھاجانی! تاجو نہیں ملی، آؤں کا کوئی نان بھی نہیں ملا، تمنا نہ بھی پھر آیا، اوں کہاں گئی؟ کچھ پتا نہ چلا، میری تاجو کوئی۔“

بس پھر کیا تھا۔ چاچی بیگما کی مست گھر کی بچی بچی دیواروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے اپنے حواس کو بچتی، تاجو ان کی انگوٹھی اولاد جی ہر سرکس میں کرب دکھاتے ہوئے ہلندی سے ایسا گرا کر کھرتا تھا۔ بیگما نے برادری کے کہنے پر کچروں کی ٹھوڑی سر پر اٹھائی، پہلے پہل چاچی بیگما کے ساتھ نازک سی تاجو جاتی تھی مگر جب رانجن کی شادی ہوئی سانولی کو رانجن نے مجبور کیا تو تاجو نے ماں کو گھر بٹھا دیا، خود سانولی کے ساتھ پھیری پہ جانے لگی سانولی نے محسوس کیا کہ ساجن تاجو میں دلچسپی لیتا ہے تو ایک دن اپنی بیٹی پر بھی خرچ کر کے وہ سونے کی تار جیسا چلا خرید لائی اور ساجن، رانجن کو بتا کر تاجو کی انگلی میں پیرا دیا، رانجن نے اس پر بھی کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا بس بُرا سا متنا کر چپ ہو گیا جب کہ ساجن کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، وہ سانولی کا مشکور و مطمئن بن کر اُس کے لیے کالج کی خوب صورت چوڑیاں خرید لایا، اُسے دیں تو وہ خوشی سے بولی۔

”ساجن! اتوار اور نہیں، چھوٹا بھائی ہے۔“

چاچی بیگما کو تاجو کی شادی کی فکر نہ آئی ہو گئی، وہ سامان جمع کرنے لگی، بے شک تاجو کی کمائی تھی مگر وہ اُسے قرض بخش کر جمع کر رہی تھی..... حالانکہ ساجن نے کسے لفظوں میں سامان کے لیے مسخ کیا مگر چاچی بیگما کے سینے میں متا بھرا دل تھا جس میں بیٹی کی شادی کے ارمان تھے، وہ بچھی داسوں کی کیا شادی؟ اور کیا شادی کے ارمان؟ شہر سے ٹیلوں ڈور جھلکی بنا کر رہنے والی بھٹی داسوں کی ساری برادری دیرے دیرے کچے کچے کھرکنا کرتی سالوں سے وہ رہی تھی، چاچی بیگما اور رانجن، ساجن بھی ان ہی کے درمیان آباد ہو گئے تھے۔ سب کے اپنے

اپنے کام تھے کوئی محدودی کرتا تھا، کوئی کھوتا گاڑی چلاتا تھا، کوئی سسڑی تھا مگر زیادہ تعداد میں مرد مختلف چھوٹے بڑے جرائم میں مبتلا تھے۔ اُن کی عورتیں پھیری پر جاتی تھیں۔ کپڑے چوڑیاں، مٹی کے برتن بیچنے کے لیے کئی کئی میل کا سفر طے کر کے شہر کی بنی پرانی کالونیوں میں دیکھ لکھتی تھیں، مگر جب سے نئی کالونی میں تاجو کم ہوئی جب سے برادری کی سب عورتیں خوف زدہ ہو گئیں، کئی روز تک کام نہ گئیں، مگر ہر گھر میں بیکار، رانجن موجود تھا جس نے ہڈیاں جٹا کر کام پر جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ سانولی واحد مضبوط ارادے والی تھی جو سال بھر ڈوٹی رہی، رانجن سر سے ہیر تک الاؤ کی طرح بیلے لگے۔

”کسی رोज ٹو سرے ہاتھ سے مر جاوے گی؟“

”اچھی بات، کسی گیر کے ہاتھوں مرنا سے اچھا کر ٹو مجھے ماروے، پر ما کام پر نہ جاؤں گی۔“ ننھی شہزادی کو چھانی سے لگا سے وہ بولی۔

”تیرا تو باپ بھی جاوے گا، میں جراثاج کر رہا ہوں۔“ رانجن کو پچھنے لگ گئے۔

”جیسے کھال ہے، تاجو کی کس نے تھک ہوئی کر دی، یا چندہ فن کر دیا یا کہیں قید رکھا، ایسے میں بھی تو کوپ جہ نہ نہیں۔“

مگر رانجن اُس پر ہم کی طرح پھٹ جاتا۔

”دیکھ میرا اٹھتا ہاتھ لگا تو ہائے ہائے کرے گی بھول باتیں نہ کیا کر، کیسے بھانوں سے ماری برادری کی عورتاں پھیری پہے جاویں ہیں، ایک بھی تاجو کی وجہ سے سب کے نام نہیں چھوڑ دیا۔“

”ٹو مرد ہے، ٹو کر کام۔“ سانولی کے منہ سے یہ جملہ بھیلنے کی دیر تھی کہ رانجن نے روٹی کی طرح دھنک کے رکھ دیا۔ کئی دن وہ جگ جگ ستر پہ پڑی ہائے کرتی رہی۔

اس واقعے کے بعد جیسا سارا وقت اور گزر گیا مگر اُس کا جھگڑا تو معمول کی بات تھا وہ بھی ضد کی جتنی بھی روز رات کھاتی مگر کام پر نہ جاتی، لیکن آج اُسے جانا پڑا شاید اُسے یہ یقین آ گیا تھا کہ گورٹ کا کوئی ہم درد نہیں، کسی کے اگلے چھپلے اگر سنبھالنے والے ہوں تو شاید کوئی اُس کا خیال کرتا ہو مگر وہ ازل سے ہی تنہا تھی۔ برادری کا قافلہ جہاں جہاں جاتا، جس جس جگہ پڑاؤ ڈالتا رہا، وہ اُس کے ساتھ راستی پل کر جواں ہوئی تھی، جواں ہوئی تو رانجن کے حوالے کر دی گئی، برادری کے قانون کے مطابق وہی اُس کا جوڑ بنتا تھا

حالاں کہ رانجنھن سب سے زیادہ بگڑا ہوا جوان تھا، سگریٹ، چرس پینا، بانسری بجاتا اس کی عادت تھی۔ وہ اس شادی پر نہ خوش ہوئی اور نہ رو سکی، قسمت کا لکھا جان کر چپ ہو گئی۔ اپنے نام کی طرح سانولی سلونی، کجبراری اکھوں والی رانجنھن کو انھی تو بہت لگی وہ اس کی وجہ سے خود کو نہ بدل سکا، شاید اس کی وجہ بچپن کی پختہ عادتیں تھیں، حالاں کہ کئی بار اس کے بگڑی دوست جیون نے بھی اُسے سانولی کے حق میں سمجھانے کی کوشش کی اور ہر بار بیکی کہا۔

”اوئے رانجنھن! بھاجائی بہت اچھی ہے، کھپال رکھا کر۔“

”ہا! بہت اچھی ہے، اوئے جیون! تو کیا جانے عورت جات کی میساری کو۔“ وہ ہنستا۔

”واہ! کیوں بھی؟ کیا میری جتان نہیں۔“

”اوں گریب ہماری بھاجائی ایس سانولی سے اچھی ہے، ما اپنی سانولی کی بات

کروں ہوں۔“

”اوئے! اوں بھی بہت اچھی ہے، ترے ساتھ گیارہ کر رہی ہے۔“

جیون کی بات پر وہ کچھ بول بال کر چپ ہو جاتا اس وقت بھی جیون شہزادی کو روتا دیکھ کر چاروں طرف سانولی کو دیکھنے کے بعد پوچھنے لگا۔

”آج بھاجائی جرنہ آوے ہے۔“

”اوں کو آج بڑی مشکل ہے کام پر بھیجا ہے۔“ اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے جیون کی

طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اُس کا مطلب تو ہے بھاجائی کو بھیج کے چھوڑا، یہ سخی جان دورو کے بے حال ہو رہی ہے، ایں کے منہ ما بھی جراسی چائے گیروے۔“ جیون نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اوئے! یہ اوں کے سعالے ما اپنی ماں پر گئی ہے رات دن بس رووے ہے تو چھوڑ اس کو یہ بتا کوئی مال پانی لایا کہ نہیں۔“ ”اُس کو کہہ مشکل سے لایا ہوں، یہ عورت جات گھٹی میسار ہے۔ بکساں ما تالے لگا کے سمجھے ہے کہ روپیہ حقوق ہو گیا، پر کیا یاد کرے گی رے، ما پورے پانچ ہزار نکال لایا ہوں۔“ جیون نے دائیں آنکھ دبا کر بائیں طرف کی آنکھ کو مائل دیتے ہوئے اکڑ کے بتایا تو رانجنھن اس کا راتے پر داد دینے کے لیے قہقہہ لگا کے ہنسا، جیون نے بھی

اُس کا بھرپور ساتھ دیا، اُن کے قہقہے کی آواز پر شہزادی اور زیادہ رونے لگی۔

”آئے ہائے! اس ناراد نے روتا ڈال دیا تو بیٹھ، ما اسے چاچی بیگما کئے چھوڑ کے آتا ہوں، پھر بجا رہیں گے۔“

”دا چاچی بیگما پاگل دیوالی بالک کو کیا سنیلے گی؟“

”وہ سہزادی کو نا جو سمجھے ہے۔“ رانجنھن نے شہزادی کو کجھولی سے نکالتے ہوئے کہا تو جیون کو سخی سی نا جو یاد آگئی۔

”بہت اندھیر چٹاکیا کسی مردود نے، نا جو کی صورت بھلائے نہیں بھولتی، چاچی بیگما کی حالت بہت دکھی کرے ہے۔ اُس کی لاش ہی مل جاتی تو صبر آ جاتا، مگر یہ تڑپانے والا روگ چاچی بیگما کی جان لے لے گا۔“

”اوئے ہوئے! بھی کمال ہو گیا تجھے بھی ماری سانولی والی پیاری ہو گئی، اُد کا نام نا جو ہے، ہے نا۔“

”تو بہت چالم ہے، مگو ماڈی ہے پھر بھی نا جو کے لیے اتنا کڑا بولے ہے۔ چل جا، جلدی والہ اس آئیو۔“ جیون کو کبھی بھی نا جو کے لیے رانجنھن کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں آخر وہ قہمی تو اس کی بھی پروردی کی، بس رشتے داری نہیں تھی ویسے بھی جیون فطرتاً اتنا کٹھن نہیں تھا۔ وہ تو سانولی کے لیے رانجنھن کو سمجھتا ہی رہتا تھا، یہ الگ بات تھی کہ کبھی رانجنھن نے اُس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس وقت بھی وہ مصعوم سی شہزادی کو چاچی بیگما کے حوالے کر کے پوری لاپرواہی سے اُس کے ساتھ آکر اکیلے کے لیے چل دیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب سانولی نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے گھر میں قدم رکھا، ہر پرکھی گھڑی کا بوجھ آدھا تھا مگر ہر من کے ہو رہے تھے، بازو اکڑے ہوئے تھے اور کندھوں میں عرب کر کا درد ست آتا تھا۔ گھڑی ایک طرف ڈال کے تھکے سے پٹنگ پر ڈھیر ہو گئی، ٹٹھائی روشنی میں دوسرے پٹنگ پر لیٹے ساجن نے اُس کی طرف دیکھا، وہ آج ایک دن کی خواری میں حد درجہ تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پسینے سے شرابور، چوڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھینک رہی، ساجن نے اُنھ کر کاٹی زدہ گھڑے سے سلور کے کنوڑے میں اُس کے لیے پانی اٹھایا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کیا جلدی تھی اُد کا دھت لگان کی، وہ پھر کو آ جاتی۔“

ہے، لٹکا ہوں گے کسی کی داستانِ سناری تھیں شاید ایسے لیے اُسے شہزادی کا رونانا چھانڈ لگا اور منہ سے پھٹکے اُڑانے لگا۔

”اِس غصت کا گھا دبا دے، رات دن رون پے لگی رہوے ہے، دفن کر دے میرے سامنے سے۔“

”یا تیری کچھ لاگے ہے، پر تجھے اس وکھت کچھ پتا نہیں، بوتل چڑھا کے جو آیا ہے۔“ سانولی نے کافی دنوں بعد ہلکی سی آواز نکالی تو اُس نے گھور کے دیکھا اور طنزیہ بولا۔

”سماں ہے بھی، ابلی تک تری جپ میں بُنان کام کر ہے، ماتو بھجوں تھا کہ سُسری کو زنج گما گیا۔“

وہ بتا کچھ کہ شہزادی کو لے کر لینے لگی تو وہ غصے سے چلایا۔ ”ملکہ عالیہ! اجل روٹی پانی لا، کیا آرام کرن چلی ہے۔“

”کچھ نہ ہی ہے، بپان کو ہوگا تو پکاؤں گی۔“ اُس نے جواب دیا، اُس کے پٹھے لگ گئے غضب سے منہ سے بخوے چادر سرخ ٹوٹ نکال کے اُس کو دیے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے لیٹ گئی، چند لمبے وہ ان ٹوٹوں کو گھورتا رہا پھر اُس پر ایک کڑوی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

حریف کچھ دن بیت گئے، سماجن دن برداشت تو تھا ہی، فیصل آباد میں کسی پلازے کی تعمیر میں حردوری کا کام ملا تو اپنے پکڑوں کی پوٹلی لے کر فیصل آباد روانہ ہو گیا اُس کے جانے پر سانولی جی بھر کے روٹی، اُسے فکر لاحق ہو گئی کہ اب شہزادی کا کیا ہوگا؟ اُسے کون سنبھالے گا؟ یہ خیال جوں ہی اُس کی زبان پر آیا تو راجنھن نے بانسری بجاتے بجاتے ڈرائزک کے مشورہ دے دیا۔

”کیا بھکر ہو گئی، میں اُس کو اپنے ساتھ لے کے جائیو۔“

”پر.....“ اُس کی زبان لڑکھرائی۔

”اب شکل کم کر لے، جرابان سزئی بجانے آؤں، تجھے درد اٹھے ہے۔ جا، اے ساتھ لے جا.....“ وہ اس قدر گھٹیا قسم کا جیسی بن کے بولا کہ وہ آنسو ضبط کر کے شہزادی کو ساتھ لے کر جانے پر مجبور ہو گئی، مگر منکوں سڑک چلنے ہوئے قدرے مشکل کا سامنا کرنا پڑا، سر پر بھاری گھڑوی اور گود میں شہزادی، موسم بھی قدرے سرد ہو گیا تھا، پھر سردی کی لہر سرسراہٹ کی پیدا کر

اس دہلی دہلی خاموشی میں کئی ہفتے گزر گئے، وہ کلوہ کے تیل کی مانند کام میں نجی رہی، آنکھوں میں گہرے گڑھے پڑ گئے، گندمی رنگ مجلس کرالا پڑ گیا، زخار کی ہڈیاں اتنی نمایاں ہو گئی تھیں کہ دیکھنے والے اُسے لی بی زدہ محسوس کر رہے تھے، پچھلی ہوئی ایزمیں اور سوچی ہوئی بھری انگلیوں کے ساتھ جب وہ پٹنگ پر گر کے ہولے ہولے ہٹکارے بھرتی تو اُس کے درد پر صرف سماجن ہی کھتا اُسے دکھ تھا کہ دھیرے دھیرے اُس کی پیاری سی بھالی پیاریوں کی ہستی میں داخل ہو رہی تھی، اُس کی خاطر جو کہ رسک تھا وہ بھی تھا کہ کام سے آتا ہوا کھاتے آتا، جب اخبار میں اپنی روٹی کھول کر اُس کے سامنے رکھتا تو پاؤں سیٹ کر اٹھ بیٹھتی، آہستہ آہستہ نوالے تو زنی تو وہ اُسے سوچ کے سمندر سے نکال لاتا۔

”بھاجانی! اس طریقوں کدو بھولتی رہی تو راجنھن ہمارا تمام ہی بھول جاوے گا۔“

”راسا جن! کھد کو یاد رکھتی تو روح ہی مرتی..... کتوں ہیں کہ موت کی کھنکھت بہت ہودے ہے پر ہاتھوں ہوائی نہ ہی جتنی ماہر داس کی۔“

”اگر اس طرح برداس کرتی رہی تو، تو کھم ہو جاوے گی، بھائی! آنکھ خشکی کا گھلا ہے جو پائندوں کے پاس پر پائندوں سے دور ہے۔“ سماجن نے کہا تو روٹی کا نوالہ اُس کے حلق میں پھنس گیا۔

”جھگڑی تو اُس دن ہی کھتم ہو گئی تھی جس دن مانے اس راجنھن سے سادی کی تھی، اب تو قبر خانے میں پڑی لاس ہوں، راجنھن جس مٹی سے بنا ہے اُس کا احساس نہیں ہے، اُن کا صرف پیسے چاہئیں..... نہ لیں تو ماری تکہ بوٹی کر دے گا۔“ پانی کا کنوڑا ہوتوں سے لگتا ہے تو وہ بولی۔

”مایہ سب نہیں دیکھ سکوں، دل چاہے ہے یہاں سے چلا جاؤں۔“ سماجن نے افسردگی سے کہا اور اٹھ کر اپنی چار پائی کی طرف چلا گیا۔ سانولی کا دل بھرا گیا، ایک وہی تو غم خوار تھا جس سے دکھ سکھ کہہ لیتی تھی، اگر وہ بھی چلا گیا تو بالکل اکیلی ہو جائے گی، یہ سوچ ہی اُسے پریشان کرنے لگی، تب ہی شہزادی جاگ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

وہ اُسے چپ کر رہی تھی مگر وہ بہت بھوک تھی اس لیے چپ نہیں ہو رہی تھی، مگر میں دودھ کی بوتل بھی نہیں تھی رات بھی بہت ہو گئی تھی وہ اُسے چھپتا کے سنانے کی کوشش کرنے لگی، عین اُسی وقت راجنھن آ گیا۔ اُس کے قدموں کی لڑکھائز متاری تھی کہ وہ لی کر آیا

رہی تھی، مگر وہ چلتی رہی۔ برائے نام مال ڈکا..... شام ڈھلے جب گھر پہنچی تو شہزادی کو نہ صرف بخار تھا بلکہ شہزادی کو تو جھیکیں بھی آ رہی تھیں۔ اُس نے اُسے جلدی سے چائے بنا کر پلائی مگر چائے تو چائے تھی دوا کی ضرورت بڑھتی چلی گئی..... رات بھر کا انتظار کرتی رہی لیکن رات کے گیارہ بجے تک وہ گھر نہ آیا، ہمارے وہ اے سبلی پیسہ ہی رضائی میں ڈکا کے لیٹ گئی۔ اُس کے اپنے بچے جسم کا کمال تھا کہ شہزادی اُس سے لگ کر سو گئی جب کہ وہ ساری رات بخار میں جھکتی رہی، نہ کوئی دوا دارو کرنے والا تھا اور نہ روٹی پانی دینے والا..... جانے کب رات بیت گئی؟

صبح اُٹھی تو جسم بخاری حدت سے تپ رہا تھا۔

شہزادی بھی دھوش پڑی تھی اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ پھر کچھ سوچ کر سیلا سا دونا اوڑھ کے باہر نکلی تو سامنے سے رات بھر آ رہا تھا اُسے صبح سویرے باہر دیکھ کر مردانہ غیرت جوش میں آ گئی۔

”یہ صبح میرے کہاں کے ارادے ہیں؟“

”تجھے کیا ہو تو رات میری سے گھبرا آیا۔“ وہ دھیرے سے کہہ کر واپس اندر آ گئی۔

”کوئی ناستا پانی بھی بنایا کر نہیں..... چنل اُتار کے اپنی چارپائی پہ لیٹے ہوئے

پوچھا اور رنگ دار آؤٹی نہیں اوڑھ لیا۔“ گو، مگر ماہر کھانے کے واسطے نہیں رات سے سہرا دی اور ماہر بخار میں جل رہے ہیں۔“ اُس نے بتایا تو اُس نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

”ترے کہنے کل وہی جھڑی ہو گئی جا سنا سے دودھ پتی اور آج ملے۔“

”کل سارا مال بچ گیا۔ صرف ایک جوتا ایکا اؤں کے پیسے بھی آج ملاں گے۔“

”تو پھر جبر چاٹ لے، اور آج سارا مال نکال کے آتے ہیں کہ میرے لاہور جاؤں گا مال واسطے، آٹھ دس بجار کر دے۔ کچھ مایوس سے لوں گا۔“ اُس نے ایسے حکم سے کہہ دیا جیسے وہ جائے گی اور درختوں سے ٹوٹ توڑ لائے گی۔

”آٹھ دس بجار! ایک بجاکر جیادہ پی لی اتے پیسے کہاں سے آویں گے۔“ ساتولی نے دھڑلے غر سے لہجے میں پوچھا۔ ”آج وہ گھڑیاں لے جائیں گا سارا مال میں بھاد کا ہے۔“

ساتولی سہرا دی کے ساتھ دو گھڑیاں آٹھا کر جاؤں۔“ غیرت اور غم کے باعث اپنی کاک آواز پر رقت طاری ہو گئی۔ ”خمس! خمس! موت پڑ گئی تجھے، سہرا دی کو مرے کچے چھوڑ دیا۔“

ما آج گھر ہوں“ وہ غصے سے بولا تو وہ سوچ کر کہ اسے کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں چپ ہو گئی، مگر دل غم سے بھر گیا آنکھیں برسنے لگیں، اُس کے منہ سے ہلکی سی سکاری نکلی تو وہ گر بنے لگا۔

”پھیری پہ جان سے سپلے غصے ڈال دے تو آج سارا مال نکال کے نہ آئی تو ماتھے ناک چوٹی کاٹ کے نکالوں گا۔ برادری کی سب جتناں، ہنستی چلتی جاویں ہیں اور تو۔“

”سب مرد بھی جھڑی کریں ہیں، سب جتناں پیٹ بھر کے روٹی بھی کھا دیں ہیں، رات سے کچھ نہیں کھایا، بخار سے پنڈا چمک رہا ہے۔“ وہ گلہ کرتے کرتے رو دی۔ مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا، نہ ہوا..... اُسی کو مات تھی سو غم دھسے کے ساتھ کچھ سوچ کر شہزادی کو خوب پیار کیا اور اُسے ابھی طرح رضائی اُڑھا کے دو گھڑیوں کو اکٹھا ہی باندھ کے سر پر رکھنے کی کوشش کی مگر بخار کے باعث جسم پر ہاتھ طاری تھی گھڑیوں سمیت گر گئی اُس کے گرنے کی آواز پر رات بھر نے ذرا سا سر اٹھا کے دیکھا اور پھر اپنی بن کر کہیں سرے اوپر تک کھینچ لیا۔ وہ کچھ دیر اپنے نصیبوں کو روٹی رہی پھر بنا گھڑی لیے گھر سے باہر نکل گئی..... اُس کے جانے کی ہلکی سی آہٹ پر رات بھر نے دوبارہ سر کھس سے نکال کر دیکھا تو شیشا کے اٹھ بیضا دھنوں گھڑیاں فرش پر پڑی تھیں، شہزادی رضائی میں سوئی ہوئی تھی۔

”یہ ساتولی اگلی کدھر لگی۔“ یہ سوچ کر جلدی سے پٹنگ سے دروازے کے باہر بھاگ کر دیکھا اٹھا مگر وہ گلی کے آخری کونے تک نہیں دکھائی نہ دی اُسے دروازے پر پریشان کھڑا دیکھ کر برادری کی عورتوں، مردوں نے ڈک کر پوچھا..... مگر وہ کچھ بول نہ سکا وہ سب اپنے اپنے کام پہ چلے گئے اور کس سے پوچھتا، یہ تو سب اپنی برادری کی جھکیاں اور کچے گھرتے جو غیر قانونی طور پر آتے تھے، جنہیں شہر والے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گندگی اور پکڑنے کا ڈھیر بکھتے ہیں، یہاں دُور دُور تک اُس کی برادری ہی آباد تھی وہ کس سے پوچھتا اس لیے چپ چاپ اندر آ گیا اور دوبارہ لہس میں گھس گیا، کچھ دیر بعد گھر کی نیند نے آکلیا، اُسے کچھ ہوش نہیں رہا شہزادی نے رو، رو کے اُڑا مال کر لیا، چائی بنیکا اتفاق سے ناچو ناچو پکارتی آ نکلی تو شہزادی کو سینے سے لگا کر اپنی جگہ میں لے گئی وہ بے سندھ ہو سچا ہر رات بھر کا جاگتا تھا، فکر، غم، غم تھا۔ سوئے جیسے ہوش ہی نہیں رہا۔“ وہ مہر سو یا رہا، زہرے چوٹ نے پکارا تو کسمایا اور ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ ۲

”اُوئے را آنجن!“

”اُوئے آجا اندر“ بھر پور ہونگائی لے کے اُس نے جواب دیا۔ چہلچوں میں جیون اندر آ گیا اور اسکی چارپائی کے پاس بڑی ہونٹ پر بیٹھ گیا۔

”کیا تم بھرا؟“ اُس نے بھائی لیتے ہوئے جیون سے پوچھا۔

”شادا بھئی! بچے ہیں ترے مغرب ہو گئی تو سورہا تھا۔“ جیون نے ہنس کر کہا تو وہ اٹھ بیٹھا۔

”بس کر ایسی آٹھ گئی کچھ پتہ ہی نہ چلا، سہادی، اُوئے ہوئے۔“ اُسے شہزادی کا خیال آیا تو اٹھ کر اُس کی طرف بھاگا مگر بستر خالی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”سہادی کہاں گئی؟“ وہ پریشان ہو کر دروازے سے نکلے والا تھا کہ جیون نے مسکرا کر کہا۔

”چاچی بیگما کے پاس دیکھی ہے، پر تجھے نہ پتا چھوڑی کہاں ہے؟ جیون نے بتایا تو وہ پرسکون ہو کے دوبارہ بیٹھ گیا۔

”بتایا نہ سامو گیا تھا، سہادی بھی سوئی پڑی تھی۔“ وہ مطمئن ہو کر بتانے لگا لیکن چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے جیون نے جب سانولی کو نہیں دیکھا تو پوچھا۔

”اور بھاجانی!“

”اُون کی کچھ نہ پوچھ سسری کو کھر سے نکالوں گا دیکھ وہ پڑی گھڑی نواب جادی جانے کدھر کو نکل لی۔۔۔۔۔ اُس نے کف اُڑاتے ہوئے کہا۔

”پھیری ہے چاتی تو مال تو لے جاتی، میں تھار کا مال گھرا پڑا ہے اُون کیا چنن کو گئی ہے۔“ وہ چلا یا۔

”بھاجانی بہت اچھی ہے، سب نہ کیا کر، کے پتا اُون اُدھار والے پیسے لین گئی ہو۔“ جیون نے دیر سے سانولی کی ہمدردی میں کہا۔

”اُون بھارڈ میں جاوے، مجھے دس تھار دیوے بس۔“ رانجنھ نے تملاکے کہا۔

جیون خاموش ہو گیا کیوں کہ وہ یہ جانتا تھا کہ رانجنھ کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اس لیے وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔ رانجنھ کچھ دیر چارپائی پر گردشیں بدلتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھنے بیٹھنے بہت سادقت گزر گیا، رات گئے چاچی بیگما روٹی بکلی شہزادی کو چھوڑ گئی،

رانجنھ شہزادی کو اٹھائے باہر گیا، تندور سے روٹی کھائی شہزادی کے لیے پلاسٹک کی کھلی میں دودھ لیا اور واپس آ گیا، سانولی ابھی تک نہیں آئی تھی اُس کا ذہن اُنجنھ کا شکار ہو گیا، شہزادی کو دودھ پلایا وہ دودھ پی کر سو گئی تو وہ سگریٹ سلاک کر کش لگانے لگا، سگریٹ ختم ہوئی تو بائسری ہونٹوں سے لگا، بڑی دیر بائسری بیٹا رہا، سانولی کا دور دور تک آتا پتا نہیں تھا، اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ پھر بالکل مطمئن ہو کے سو گیا، رات کا تیسرا پہر شروع ہوئے تو تھا جب دروازہ کھلا اور قدموں کی آہٹ اُبھری، تو وہ بڑبڑا کے اٹھ بیٹھا، بکلی سی زرد روشنی میں جیون کھڑا تھا انتہائی افسردہ اور اُداس ایک ہاتھ میں سبز تارنجی پھولوں والا وہ پتا تھا اور دوسرے ہاتھ کی منجی بندھی رانجنھ اُسے اس طرح دیکھ کر جھٹکے سے اٹھا۔

”جیون! اُون اس وقت کبھر تو ہے۔“

”سب کبھر ہے ترے واسطے تو کبھی کبھر ہے پروا کر ماں ماری تھی۔“

”کیا بولے ہے؟ صاف صاف بتا۔“ رانجنھ کو کبھی مرتبہ کچھ اُنجنھ سی ہوئی۔

”لے دس تھار روپے، سانولی کی منجی مالینے ہوئے تھے اور یالے اُون کی لال ہری چوڑیاں کی کرچیاں، اُون سب بال بچ کے پھارغ ہو گئی۔“ جیون نے ہاتھ میں پکڑا دو پٹا جس میں روپے تھے رانجنھ کو تھما دیا اور منجی میں چوڑیوں کی کرچیاں اُس کے سامنے کر دیں۔ وہ کچھ نہ سمجھا ہمیشہ کی طرح آگ بگولہ ہو گیا۔ ”اُون حرام جادی بھگ گئی کا ماہر اداری کو بلا تا ہوں ناک چوٹی کاٹ کے نکالوں گا، وادارے گھر مار بن کے قابل نہیں، بتا کہاں گئی اور تجھے کیسے پتا چلا؟“ وہ جیون پر چڑھ دوڑا۔

”وانوی سستی ماگھوئی تاجو کے طرچیوں، بس اتنا بھرت ہے تاجو پتا مول کے بک گئی اور سانولی نے ترے دس تھار پورے کر دیے۔ اُون کی لاس نوی کالونی کے تھانے میں پڑی ہے، اُون تھانے سے ابی اطلاع آ جاوے گی۔ کم نہ کر لے سنبھال ایس سانولی کی نسانی۔“ جیون نے چوڑیوں کی کرچیاں اُس کا ہاتھ کھول کے اس میں ڈال دیں۔ وہ ہکا بکا سا جیون کا منہ بکھٹنے لگا۔

”کیا بک رہا ہے تو، اُون لُٹی لٹکتی نے ماری کیرت کا سودا کر دیا۔“

”جرا سا دھیرے بول! کیرت ترے مرے کئے کہاں؟ اُون باؤلی نے ترا کہا نہیں ٹالا، دس تھار پورے کیے۔ کھد کرچی کرچی ہو گئی، دیکھ اُون کی منجی لیر لیر ہے، اُون کی

لال ہری چڑیاں کھون مابھری ہیں۔ اُس کی دھپا پہ سبک نہ کر..... ترا انتھان نہیں پھا کر گئی۔“

چون احساس ندامت سے کہتا ہوا ہار کھل گیا، رانجن کو ایسا محسوس ہوا جیسے سے زیادہ دُکھی اور تادم ہے جب کہ اُس نے خود اگلے ہی لمحے سر جھکا اور وہ کر چیاں میں اُچھال دیں، دوپٹے سے پیچے نکال کر جیب میں رکھے بانسری اُٹھائی ایک کپڑوں کا لیا اور شہزادی کو اٹھا کر ہار کھل گیا۔ کسی اور کبھی بستی میں آباد ہونے لیے۔۔۔۔۔



جیراں سے ماں تک

بچپن فٹ گلی کے کونے پر رمضان کے قدم ہوتے تو اُسے گھر کے بند کمروں میں بھی خیر ہو جاتی، وہ لپک کر دروازہ کھول کے تھوڑی سی گردن باہر نکال کے اُس کو آتا دیکھتی اس ادا پر رمضان ٹھوم ٹھوم اُٹھتا اور اپنے انتخاب پر دل ہی دل میں خود کو داد دیتا کہ اُسے اپنے لئے منتخب کر کے اُس نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ اتنی چاہنے والی بیوی ایک غریب بڑی منڈی کے مزدور کو کہاں ملتی ہے؟ اور جو سر سے تھک ہو بھی موتیوں میں تو لے کے قابل!

مگر غریب بوڑھے باپ نے اُسے رمضان کے خالی کنگول میں ڈال دیا۔ وہ صابر شاکر لیوں پر دھیمی مسکراہٹ سمائے اُس کے شامل حال ہو گئی۔ قاقوں میں قاتے کر کے بھی مسکراتی رہتی، وہ ہی تادم ہو کر اُسے کہتا۔

”جیراں! تو آسان کی خوشی، کہاں اس دوزخ میں آگئی۔ دن بھر کی مزدوری میں پیٹ بھر روٹی بھی نہیں ملتی ترے خوبصورت بدن کے لئے تو ریشم کے کپڑے ہونے چاہئیں مگر میں، میں تو.....“

”ایسے نہ سوچا کر! میں بہت خوش ہوں، تُو مجھے اتنا چاہتا ہے اور کسی شے کی مجھے ضرورت نہیں۔“ وہ اُس کا ٹھلہ اُپک کر ڈھیر سارا حوصلہ اس کی سانسوں میں اُتار دیتی تو وہ دیوانہ دار اُسے پیار کرنے لگتا، اس کی ہر عمر دی پیار کے ذریعے دُور کرنے کی کوشش کرتا اور اُس میں وہ کامیاب بھی رہتا۔ جیراں غربت اور قاقوں میں بھی مدد بھری نگاہوں سے اُس کا انتظار کرتی، اُس پر دھاری مدد دیتی جاتی، جس دن کچھ بھی پکانے کو نہ ہوتا تو وہ تب بھی مسکرا کر اُس کے گلے میں ہاتھوں کا ہار ڈال کے فضا اُتاتے۔

”مجھے بھوک نہیں تھی، ترے لئے اچار پراٹھا بنایا ہے.....“ وہ کچھ جانتا کہ جیراں ایسا

کیوں کر رہی ہے، اندر سے خدمت سی محسوس کرتا اور سوچنے لگتا کہ کیا کیا جائے جس سے وہ وقت کی روٹی تو سکون سے پلے۔ مگر شاید اُس کی قسمت میں رزق اتنا ہی کھاتا تھا کہ لاکھ لاکھ کوشش کے باوجود بس پُری سُوری مزدوری ملتی جس میں سب کچھ نقد لے کر آتا تو بچا لہا جاتا۔

زندگی کی ان ہی عجیب چیزوں میں گول مٹول سا شعبان آ گیا تو وہ دونوں خوش ہو گئے۔ شعبان جیراں کی طرح خوبصورت تھا بڑی بڑی سرگیں آنکھیں، ستواں ناک اور باریک گلابی ہونٹ! وہ جیراں کی گود میں سُسرلاتا تو رمضان کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو جھبکا گئے۔

”جیراں! اللہ نے ہمارے گھر میں چاند اتارا ہے۔ یہ چھوٹا سا کچا کچا گھر جنت سے کم نہیں۔“

”اللہ ہمارے گھر کو بُری نظر سے بچائے۔“ جیراں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ڈھاکرتی اور ننھے شعبان کو سینے سے لگا کر بچہ لگتی تھی۔ شعبان میں تو اُس کی جان بھی رات دن، ہر پل ہر گھڑی اُس کے لئے وقف کرنے کے باوجود رمضان کے لئے بھی خدمت اور وفاداری میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی۔ صبح پیار سے ناشتا کر کے رخصت کرتی، دن بھر شعبان کے کاموں میں مصروف رہتی، شام کو جو کچھ پکانے کو ہوتا صبح سے لپکاتی اور اُس کی راہ دیکھتی۔ اسی تو اُس میں چپکے سے پانچ سال بیت گئے اب شعبان ساڑھے تین سال تین بہنوں کا ہو گیا تھا معمولات زندگی میں کوئی بہتر تبدیلی نہیں آئی تھی، اخراجات میں اضافہ ہوا تھا اور آمدن اتنی ہی تھی جس کی وجہ سے مسائل میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رمضان کے روپے میں ہلکی سی تبدیلی بھی جیراں محسوس کر رہی تھی گو کہ نسبت بڑی تبدیلی نہیں تھی، بس رمضان کچھ دنوں سے اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ بون ہاں میں بات کا جواب دیتا اور لیٹ جاتا شعبان سے بھی برائے نام بات کرتا۔ جیراں کو اندر ہی اندر گریڈ کی ہوئی تھی کہ رمضان کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو محبوب شوہر اور نوٹ کر چاہئے والا باپ تھا، جس نے بیٹے کی پیدائش پر بساط سے بڑھ کر خوشی منائی تھی، یار دوستوں کو دعوت دی تھی اب ایسا کیا ہوا جو رمضان اپنی ذات کے ڈبے میں بند ہو گیا ہے؟

بہی بات رات اُس نے کھانے کے بعد اُس سے پوچھی تو وہ خاموشی سے بولا تھا۔ ”ضروری نہیں ہر بات تجھے بتا کر لائنس لیا کروں۔“ وہ ہنسی بھرے رمضان سے ملتی تھی۔ چپ چاپ گندے برتن دھو کر تھی بچھا کے شعبان کے برابر لیٹ گئی۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا،

کھلا رہا تھا اُس کے ساتھ لیٹ کے سو گیا۔ یہ اُس کی عادت تھی کہ وہ اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر سوئی تھی۔ صبح رمضان نے خلاف معمول خاموشی سے صرف چائے پی اور کندھے پر زرد مال ڈال کے چلا گیا۔ وہ فجر کی اذان کے فوراً بعد منڈی چلا جاتا تھا۔ جیراں ویرنک نیم تلکے اندر صبر سے میں دروازے سے سر باہر نکلا ہے اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ گلی خالی تھی کوئی اکا دکا راہ گیر نماز کے لئے آ جا رہا تھا جب وہ گلی سے وائیں ہاتھ کچھ سرک پر ہونگیا تو وہ دروازہ بند کر کے نکلے کی طرف آ گئی، سوچوں میں گھر سے ذہن کے ساتھ وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی، شعبان اپنے وقت پر اُٹھا اُس کو چائے پاپے دینے وہ صحن میں کھیلنے لگا تو وہ صفائی ستھرائی میں لگ گئی مگر ذہن رمضان میں ہی اُلجھا ہوا تھا۔ آج پہلا دن تھا کہ وہ سب سے زیادہ ذہنی پریشانی کا شکار ہوئی تھی۔ گھڑیاں گن گن کر وقت گزرا، شام سے رات ہو گئی، رات ڈرا سا آگے بڑھی تو حسب معمول وہ شعبان کے برابر سے اُٹھ کر بیروں میں چپل ڈالتی دروازے پر پہنچی، وہ آج بھی ٹھیک پہچانی تھی وہ آ رہا تھا جب بالکل قریب آیا تو اُس نے سُسرلا کر اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اب رو چڑھا کر دیکھتا ہوا بولا۔

”کچھ گھر کا دروازہ یا وہ ہے، ٹوکس لئے جھانکی ہے؟“ وہ اپنے قدموں پر ساکت رہ گئی، ذہن کو دھچکا لگا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے؟“ وہ حیرت سے پوچھ بٹھکی تو وہ اُٹھ چلا۔

”کچھ کھینچ ہوا جا کے سو جا۔“

”کیوں روٹی کھا کے آیا ہے؟“

”ہاں! دوست کے ساتھ کھاتی تھی۔“ وہ کچھ دھیمے لہجے میں بولا۔

”پہلے تو کبھی نہیں کھاتی تھی۔“ وہ شک کی دلدل میں ڈبکائیں لگاتے گئی تو وہ چڑھ دوڑا۔

”جیل کر دے مجھے، ہنہ! پہلے نہیں کھاتی، آج کیوں کھاتی؟ وکیل کر۔“ وہ سختتا سے ہوا اپنی چار پائی پر لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں بھرا گئیں۔

دوپٹے سے ٹکلیں گر گئی ہوئی پھر شعبان کے ساتھ لیٹ گئی۔ اُس نے ذرا سی گردن اٹھا کر اُن دونوں کو دیکھا اور پھر اُٹھ بیٹھا، پاؤں لٹکا کر پیٹی پر بیٹھا جانے کس سوچ میں ڈوبا تھا؟ جیراں رچی آکھ سے دیکھتی ضرور رہی لیکن بچنے کی جسارت نہ کر سکی۔

رات بے کُلی میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی وہ اضطرابی کیفیت میں اُٹھتا بیٹھتا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا، باریں بار اُن دونوں کی چار پائی کے قریب کھڑا گھورتا رہا جہراں دم سادھے سوئی بنی رہی، دل کسی نے مضی میں دبا رکھا تھا کی آنسو آنکھوں کی قید سے آزاد ہو کر ٹپکنے پر دائیں بائیں طرف پیوست ہو گئے۔ صبح اُٹھی تو سرد در سے پھٹ رہا تھا، آنکھیں لال لال انکارہ ہو رہی تھیں۔ ہمت کر کے اُٹھی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے لینے رہنے کو کہا۔

”تمہارے لئے چائے ناشتا بنانا ہے۔“ اُس نے اپنی دانست میں نئی بات کی۔
”میں دوست کے ساتھ چار ہاؤس، ناشتا بھی کروں گی گا۔“ وہ گھس صاف کر کے پردوں میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”دوست کے ساتھ! کون ہے دوست؟“ وہ تشویش ناک انداز میں بولی۔

”اب تجھے دوستوں کی لسٹ بھی دیا کروں، کچھ پیسے ہیں تو دے۔“ وہ کچھ تکی اور کچھ نرمی سے بولا۔

”رمضان! تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اندر کا خوف ناک سانپ بل کھا کے باہر نکل آیا۔
”کیوں انسان کھانے لگا ہوں یا سینکھ نکل آئے ہیں میرے۔ رات دن تیرے کھک کی خاطر کوششیں کرتا ہوں اور تو پوچھ رہی ہے۔“ وہ تسخّرانہ لہجے میں کہہ کر ہنسا۔
”تو بدلا بدلا سا ہے۔“

”فضول باتیں نہ کر، دیر ہو رہی ہے پیسے ہیں تو دے۔“ وہ فیسے میں آگیا۔
جہراں نے دوپٹے کے پلو میں لپی کرہ کھول کے مڑا خرا پچاس کا نوٹ نکال کر اُس کے حوالے کر دیا۔ وہ نوٹ جیب میں ڈال کر تیز قدموں سے صحن عبور کر گیا وہ ساکت نظروں سے دروازہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس نے نہ شعبان کو بیا ر کیا اور نہ اُسے سکر ا کر خدا حافظ کہا۔ شک نے چاروں طرف سے گھیر لیا وہ ابا کے گلے لگ کے آنسو بہانے لگی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا جرم خان نے روتی ہوئی بیٹی کے سر پر لڑتا ہاتھ رکھا اور سبے ہوئے شعبان کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”شک کا بیج نہ بوی، فصل کاٹنی مشکل ہو جائے گی، چپ رہ کے ممبر کر، سب سامنے آ جائے گا۔“

”مگر ہا؟“

”بچا! ہونے والا کام ہو کے رہتا ہے اب حوصلے سے برداشت کرنا ہے، اگر رمضان بہک گیا ہے، تو کتور کیا کرے گی؟“

ابا سے مل کر بھی جہراں کے دل کو قرار نہ ملا وہ شام سے پہلے لوٹ آئی، شعبان کو نہلا کر کپڑے پہناتے خود آنکھوں میں کاہل لگایا، ہونٹوں پر اگلی لال سرخی کی تہہ جمائی اور سوچا کہ رمضان کو ان ہتھیاروں سے زیر کر لے گی۔ وہ اُس کے قدموں پر ڈھیر ہو جائے گا لیکن یہ صرف اُس کا خیال تھا، وہ کافی دیر سے گھر آیا، شعبان کو روکھا روکھا جو بھی گھر میں بندوبست ہو سکا کھلا کے سلاخا خود صحن میں نہل نہل کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ گلی میں جوں ہی وہ داخل ہوا اُس نے دروازہ کھول دیا مگر گردن دروازے سے باہر نہیں نکالی۔ کچھ دیر بعد وہ اندر آگیا، سفید کپڑوں پر پٹنی کی تہہ چڑھی تھی سر کے بال، ہینوئیں اور مونچھیں بھی مٹی سے آئی تھیں، کسے بھی مٹی میں اپنی شکل بدل چکے تھے۔ وہ سیدھا نہانے بٹھس گیا۔ وہ صحن میں بھی چار پائی پر تک کے انتظار کرنے لگی۔ وہ نہا کر نکلا تو بولا۔

”میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔“

”پتا ہے مجھے۔“ وہ طنز یہ بولی۔

”ڈی جی خان میں دوست نے کھانا کھلا دیا تھا۔“

”تو ڈی جی خان میں تھا، کام پر نہیں گیا؟“

”وہاں بھی کھا تھا، اگر وہ کام بن گیا تو اپنا کام کروں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”جا، جا، جو سا جا، میری کھوپڑی میں میری بات نہیں آئے گی۔“ وہ ترخ کے بولا۔
جہراں سمجھ گئی اُٹھنے لگی تو اُس نے جیب سے پانچ پانچ سو کے دونوں اُس کی طرف بڑھائے۔
”یہ لے ہزار روپیہ! صبح راشن لے آئیو۔“ وہ پریشان سی نوٹ دیکھنے لگی تو وہ چلا یا۔

”سانپ سوگھ گیا کیا، پکڑ اور جا کر سو جا۔“ وہ نوٹ سٹھی میں دبا ئے کمرے میں آ گئی، شعبان تہا کسسا بار تھا جوں ہی وہ ساتھ لینی تو وہ اُس سے لپٹ گیا۔ کچھ دیر بعد رمضان ۶ اندر آیا تو اُن دونوں کے قریب تک کر مضطرب سا ہونٹ کاٹنے لگا، پھر سر جھٹک کے اپنی چار پائی پر لپٹ گیا۔

جہراں نے راشن اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں منگوائیں، دو دن تینوں وقت گھر

کا چلھا جلا، رمضان کے روپے میں بھی پھر سے خوش گوار تبدیلی آئی وہ ہنسنے لگا، گھر میں کھانا کھاتا، ابھر اُدھر کی باتیں کرتا۔ چار پانچ روز بہت اچھے انداز میں گزر گئے، وہ صبح کام پر جاتا اور شام کو واپس آ جاتا، جیراں مطمئن سی ہو کر سب شگ بدگمانیاں دل سے نکال چکی تھی، اُس کے ہونٹوں پر پھر سے گلاب کھلنے لگے تھے۔ رمضان نے اُچھتی نگاہ اُس پر ڈالی تو وہ اٹھلائی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”میں ویسے ہی دیکھ رہا تھا کہ تم کتنی حسین ہو؟“ وہ یوں کلا سا گیا۔

”یہ شادی کے پانچ سال بعد بنا چلا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”میں ذرا کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔“ وہ ایک دم یہ کہہ کر باہر نکل گیا، وہ پھر الجھن کا شکار ہو گئی اُس نے سب کام نپٹائے اور شعبان کا کرتا پہنے بیٹھ گئی، اُسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی تو جیراں پریشان سی دروازے تک آئی اور پوچھا۔

”کون ہے؟“

”بھین جی! میں شہباز لالہ ہوں، رمضان ہے۔“

”نہیں! وہ کام سے گئے ہیں۔“

”اُچھا! یہ چار ہزار روپے لے لو، رمضان کو بول دینا پندرہ تاریخ کو کراچی جانا ہے تیار رہے بلکہ مجھے ملے۔“

دروازے کی اوٹ سے چار ہزار روپے اُس نے پکڑ لیے اور دروازہ بند کر کے اندر آ گئی، چار ہزار روپے رمضان کے ہتھے پر رکھ کے وہ انھیں گھورنے لگی۔ دل دوڑنے لگا طرح طرح کے دہم آنے لگے۔ کچھ دیر میں رمضان آیا تو اُس نے پیغام دے دیا، وہ چونکا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”رمضان! یہ شہباز لالہ اتنے پیسے کیوں دے گیا ہے اور تمہیں کراچی کیوں جانا ہے؟“ اُس نے پوچھا تو وہ خوشخوار ہو کر بولا۔

”مجھے تھانے دار نہ لگوا دوں، ہر بات پر سوال جواب! یار ہے اپنا کراچی میری تفریح کے لیے جائیں گے۔“

”پھر میرا دل کیوں پریشان ہے؟“

”اپنے دل سے پوچھا اور تیاری کر لی، ہم نے کراچی جانا ہے۔“

”ہم نے بھی جانا ہے؟“ اُسے حیرت ہوئی۔

”ہاں! اب سوچا، دماغ نہ چاٹ۔“ وہ بے فکر ہو کے چادر تان کر سو گیا۔

مگر جیراں کا دل ڈبکیاں کھا رہا تھا، اُسے قطعاً اُس بات کی خوشی نہیں تھی کہ وہ زندگی میں پہلی بار کراچی کی سیر کرے گی۔ اُسے تو بس رمضان کی حرکات و سکنات پر اسرار لگ رہی تھیں، شہباز لالہ کا نام ہی اُسے کلک رہا تھا پہلی بار رمضان نے اُس کا ذکر کیا تھا۔ پھر اتنے پیسے دے کر جانا تک ہی شک تو تھا۔

صبح اُس نے اُسے کام پر جانے کے لیے جھگایا تو اُس نے منع کر دیا کہ کام پر نہیں جانا، جیراں خاموشی سے اپنے کام کا میں مصروف ہو گئی۔ شعبان کو ناشتر کرا کے باورچی خانے کی صفائی کر رہی تھی کہ رمضان اُٹھ کر اسی طرف آ گیا، جھگ میں شعبان کو اپنی سانگیں چلاتا دیکھ کر بولا۔ ”اے! دو دھانڈہ ضرور دیا کر۔“

”میں آج اس کے لیے برتی اور آئس کریم لاؤں گا پسند ہیں نا!۔“ رمضان نے نرمی سے کہہ کر جیراں کے دل سے دوسرے کا کاٹا نکال دیا، وہ خوش ہو گئی۔

”رمضان! میں نے شعبان کو اسکول میں داخل کراتا ہے۔“

”کرا دیں کہ ابھی اس کی عمر یہ کیا ہے۔“ وہ بیکر ٹال گیا۔ پھر اُس دن وہ شعبان کے لیے دھیر ساری کھانے پینے کی چیزیں لایا، اُس کے ساتھ کھینٹا رہا، جیراں دیکھ دیکھ کے نہال ہوتی رہی، رات وہ باہر گیا اور چرچے لے کر آیا تینوں نے مل کر کھایا۔ کچھ دیر بعد شعبان کو سلا کر وہ اپنے دوڑنے پر کڑھائی کرنے بیٹھی تو اُس نے پوچھا۔

”تو نے تیاری کر لی ہے کراچی کے لیے۔“

”نہیں! چھوڑ ہم نے نہیں جانا۔“

”کیا! کیا کہا؟ میں تیرے مشورے پر چلوں گا کیا؟“ وہ جیسے سے اکڑ گیا۔

”اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟“ وہ خوف زدہ سی ہو کر بولی۔

”اچھا! بس ٹھیک پانچ دن بعد ہمیں جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بے فکر ہو گیا۔

اُس کا کہا اتنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ لہذا تیاری کی غرض سے اپنے شعبان کے ذرا بہتر حالت والے کپڑے دھو کر استری کیے، اُٹھتی میں رکھے اس کے علاوہ رمضان کے

کپڑے اور ضروری چیزیں جمع کر کے رکھیں، اپنی طرف سے دودن میں اس نے سب تیار کر لی۔ جانے سے ایک دن پہلے جب رمضان ان کے لیے جلیبیاں لے کر آیا تو اس نے تبا سے مل کر آنے کی اجازت لی اور شعبان کی انگلی تمام کر باہر نکل گئی۔ رمضان جن میں چار پائی بچھانے لیٹ گیا۔ وہ اپنی گلی سے نکل کر سڑک کراس کر کے آبادی گلی میں داخل ہوئی تو نیازے لوہار کی بیوی حاجرہ نے آواز دے کر بلا لیا۔ وہ اس کے پاس آگئی۔ حاجرہ نے جھٹ خوشی سے کہا۔

”مبارک ہو جیراں۔“

”کس بات کی؟“ وہ کچھ نہ سمجھی۔

”شعبان کہیں جا رہا ہے۔“ حاجرہ نے کہا۔

”کیا؟ پاگل ہوئی ہے تو۔“ شعبان کے ہاتھ پر مضبوط گرفت کرتے ہوئے کہا جانے والے انداز میں چلائی تو حاجرہ ڈر کرے پرے ہو گئی۔

”اے ہے اکھا نے کو کیوں دوڑتی ہے جا کر بھار رمضان سے پوچھ۔“ حاجرہ نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا، وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح داہیں لوٹ کے آئی تو رمضان کو تعجب ہوا، وہ اٹھ بیٹھا۔

”اتنی جلدی آگئی۔“

”ہندا! کچھل میری کمر کی تھی۔“

”ہوا کیا؟“ اب گھر نہیں تھا کیا؟“ رمضان نے پوچھا۔ ”نہیں! حاجرہ نے کچھ کہا تو میں غصے میں آگئی۔“ اس نے ٹوٹا پھوٹا لہجہ اختیار کر کے بتایا اور شعبان کو لیے کمرے میں چلی گئی۔ رمضان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو زور سے بولا۔ ”میں ابھی باہر جاؤں گا تو تبا کا بتا دوں گا، وہ خود ملنے آجائے گا۔“

”دیے تو تبا! ہم آخر کیوں جا رہے ہیں، بیٹھے بٹھائے تجھے سیر پانے کی کیا سوجھی ہے؟“ دیہاڑی جانے کی، تبا ہے کتنا خرچ ہو گا۔“ وہ ایک دم کمرے سے آکر بولتی چلی گئی۔ رمضان نے پہلے تو ہر دچھڑا لیا لیکن پھر زور سے مسکرا کر کہا۔ ”ارے خرچے کی فکر نہ کرنا پتہ یار ساتھ جا رہا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ تیرا کیا کہاں سے آگیا؟“

”دیکھ! زیادہ گرید بازی نہ کیا کر، جیسا کہ دیا ویسا ہی ہو گا۔“ وہ آن واحد میں کر لیے کی مانند کڑوا ہو گیا۔ جیراں بھلاتی ہوئی پھر اندر چلی گئی کپڑے جین اور مضرب سی، اسی وقت شعبان نے تو قلمی زبان میں اسے پکارا اور ساتھ ہی اپنی کڑی، وہ سب کچھ بھول بھال کے اس پر جھک گئی گود میں اٹھا کر باہر نکلے کے پاس لائی ہاتھ میں دھلایا گردن اچھی طرح صاف کی اور دوسرے کپڑے تبدیل کیے، شعبان کا جسم خاصا گرم تھا وہ فکر مند ہو کر رمضان کو بتانے لگی مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا۔

”تو تو دھبی عورت ہے بچے گرم ہو ہی جاتے ہیں، کوئی بخار و غار نہیں ہے۔“

مگر جیراں کا شک ٹھیک تھا۔ دیکھتے دیکھتے شعبان سچے لگا۔ اس نے فوراً سب سے پہلے مرچیں وار کے اس کی نظر اتاری، مگر وہ روپے صدقے کے نکال کے رکھے اور پھر رمضان کے سر ہو گئی۔ رمضان کی کیفیت عجیب تھی اسے جیراں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کا خیال بھی تھا۔ دوسرے اس کے ذہن پر سفر طاری تھا رات ہی تو سچ میں تھی اور اس کے لیے شعبان کی طبیعت کی خرابی الجھن کا باعث تھی۔ مجبوراً شعبان کو گود میں اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا، پیچھے اس نے جلدی سے اس کے لیے نرم سی کچھڑی پکائی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں آ گئے، جیراں نے ایک کے شعبان کو گود میں لے لیا۔ ”ایک طرف تو شعبان کو اسکول داخل کرانا چاہتی ہے دوسری طرف دودھ پیتا بچہ جان کر گود میں رکھتی ہے۔“ رمضان نے جیب سے دوائی کی چھوٹی سی ٹھیل نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

”تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو اپنے شعبان کی عمر بھی بھول گیا ہے کیا؟“ وہ چڑ گئی۔

”میں تیرے سوالوں جوابوں سے تنگ آ گیا ہوں۔“ وہ غصے سے بولا تو وہ چپ کر گئی۔ شعبان نے اس کی گود میں منہ چسپایا۔

”تیرے تبا کو کہہ آیا ہوں کہ ہم نے کل شام کو جانا ہے، آ کر مل لے۔“

”شعبان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو جانیں گے ورنہ۔“

”ورنہ کیا! تو تقریر کرنے لگی میرے سر ہانے، معمولی سا بخار ہے سب کام چھوٹ کر دوں۔“ پہلی مرتبہ اس نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ کے کمر کی طرف موڑ دی تو وہ درو سے بلہلا اٹھی۔ وہ اور زور سے مروڑا کہ جیراں کے تبا آ گئے۔ رمضان نے جھٹکے سے اسے پرے دھکا دیا اور بڑا بڑا اور یہ کہہ کر نکل گیا کہ ”زندگی اجیران بنا رکھی ہے ہونہ۔“ جیراں بازو دھلاتی ہوئی

انھی اور بھی لگیں صاف کر کے تپا سے لپٹ گئی۔

”اوئے پتر! یہ تم لوگوں نے اچانک کراچی جانے کا پروگرام کیوں بنالیا؟“

”عورت کب پروگرام بناتی ہے تپا! وہ سسکی۔

”تو رونے کی کیا بات ہے جاؤ خیر صلی واپس آؤ۔“

انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”ابا! شعیان کو بخار ہے اور رمضان کی ضد ہے وہ کل ہی جائے گا۔“

”ٹو فکر نہ کر مومی بخار ہے آتر جائے گا۔“ ابا نے چکار کے اُس کا ہنسی بوجھ ہلکا کر

دیا۔ اُس نے اُن کے لیے چائے بنائی، شعیان کو کچھوڑی کھلائی اور ساتھ ساتھ اُن سے باتیں

کرنے لگی، عشاء کی اذان ہوئی تو تپا چلے گئے وہ اُداس سی ہو گئی کچھ دیر بعد رمضان آگیا اُس

کو کھانا دے کر وہ کمرے میں آگئی۔ شعیان نے بازو پھیلائے، بخار کی خودگی میں بھی وہ اُس کا

خطرہ تھا، وہ اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔ کچھ دیر اُس کے ہتھکریالے بالوں میں اگلیاں پھیرتی رہی

جب وہ آرام سے سو گیا تو اُس نے گردن گھما کر الماری پر رکھے نائٹ بین کی طرف دیکھا، گیارہ

بج رہے تھے اُس نے بھی سونے کی غرض سے آنکھیں موند لیں۔ دفعتاً دروازے پر دستک

ہوئی، اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ”اُس وقت کون آیا؟“ تجتیس نے سر اٹھا کر وہ

دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی۔ رمضان دروازہ کھول کے باہر نکل چکا تھا۔ جیراں ہلکی

ہلکی آواز سن کر دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئی رمضان سے جو بات کر رہا تھا وہ شہباز

لالہ تھا جو کہہ رہا تھا۔

”سب تیاری مکمل ہے، پرسوں کراچی پہنچنا ضروری ہے ورنہ باؤسیٹھ نکل جائے گا۔“

”یار! بچے کو بخار ہے۔“ رمضان نے تپا کا ہاتھ۔ ”اگر مگر کی بات نہیں ہوتی چندا ہلک

جانا ہے بچے بیمار ہوتے رہتے ہیں۔“ لا پرواہی سے کہا گیا۔

”میری فکر والی بہت پیار کرتی ہے تپا بچے کو۔“

”دیکھ رمضان! یہ باتیں پہلے پھیلے تھی، تو پورے دس ہزار لے چکا ہے، دس ہزار

کراچی جا کر ٹرین لے اور ہو سکا تو کچھ انعام و نعام بھی شیخ لوگ دیتے ہیں یہ تا حوصلہ ہے، پچہ

مر، مرا بھی سکتا ہے ایسا ہونے پر چالیس پچاس ہزار اور مل سکتا ہے۔“ انتہائی سرسری انداز میں

تپا گیا۔ ”لیکن جیراں! وہ۔“ اُس نے رمضان کی بھلا ہٹ دروازے کے چپچپے سے صاف سی

تو تھرا گئی، یہ اُس کے اپنے رمضان کی آواز تھی۔

”اوئے زنانی سے ڈرتا ہے، میری ماں اُس کو لے کر ہی نہ جا، ایسے ہی مصیبت

کھڑی کر دے گی۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے، جان نکال لوں گا سُسری کی۔“ رمضان کو اپنی

مردانگی پر کارِی ضرب قبول نہ ہوئی، فوراً سینہ پھلا کر بولا۔

”بھئی! قسمت بن جائے کی تیری، چار پیسے مل جائیں گے، کہنے کو ہزاروں بچے مل

رہے ہیں، ہر سال ہم خود اوث ریس کے لیے ڈی جی خان سے ہزاروں بچے بھیجتے ہیں غریب

ماں باپ ہمیں دیکھ دیتے ہیں غریبوں کو چار پیسے مل جاتے ہیں، بچوں کا کیا ہے اور پیدا ہو

جاتے ہیں۔“ شہباز لالہ نے تسخیر آڑا لیا۔

”لیکن لالہ! پیسے کم ہیں۔“

”کیوں دل تنگ کرتا ہے تجھے دس پندرہ زیادہ ولادیں گے۔“ شہباز لالہ کی ہنسی کی

آواز کمرہ چھین کر اُس کے ہوش و حواس جھین لے گئی..... اس سے زیادہ کچھ سننے کی سکت تھی

نہ برداشت، شکاری کے خوف سے گھبرا کر بھاگنے والی ہرنی کی مانند دو جھٹ میں کمرے میں

پھنچ کر پھولی سانس اور شہم وحشی گھاؤں سے شعیان کو دیکھنے لگی وہ خود سر رہا تھا، معصوم سرخ

سفید چہرے پر ہلکا ہلکا پسینہ بخار اُترنے کی وجہ سے آیا ہوا تھا۔ اُس کے حلق سے کراتی آہ نکلی،

اس پر گر کے چوٹنے لگی۔ دیوانہ وار سینے سے لپٹا کے سکیاں لینے لگی خوف اور دشت نے اُس

پر کھینکی طاری کر دی تھی مگر تھر کا پ رہی تھی روح تک میں اذیت ناک ڈکھ اُتر گیا تھا، ہستار پ

رہی تھی جو سن لیا تھا اُس پر اعتبار کرنے کو دل آمادہ نہیں تھا مگر کان مصر تھے، اُس کا دل چاہ رہا

تھا کہ شعیان کو سانسوں میں بسا کر چھپالے، آنکھوں میں بند کر لے یا یہاں سے دور کہیں

بھاگ جائے سفاک، بے رحم باپ سے بچا کر! مگر یہ کتنا مشکل کام تھا اپنی بے بسی پر وہ پھوٹ

پھوٹ کے رو رہی تھی کہ رمضان اندر آگیا شعیان سے لپٹا دیکھ کر سمجھا بخار کی وجہ سے پریشان

ہے۔ ”کملی ہو گئی ہے تو! اخبار اُتر گیا ہے پسینہ آ رہا ہے، سو جا آرام سے۔“ اُس نے ایک ہی

جلنے میں دو تین باتیں کہہ کر بستر کا رخ کیا تو وہ سہم کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بچ بچ آرام سے تھانہ

اُس کے چہرے پر ملال تھا اور نہ ندامت! وہ ڈکھ سے بچکیاں لینے لگی تو اُس نے سر اٹھا کے

دیکھا اور دبی دبی نکلتی سے کہا۔

تھے۔ مگر وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے سب کو راضی رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ چمنی کے بعد میڈم کے دفتر کی چھانچہ پر ہنجر کے دفتر کو تالا لگا، انہوں نے اس کی صفائی کرنا اور پھر میڈم کے گھر جانا، اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ میڈم کو اس کی شکل میں تنہائی کا سا بھی مل جاتا تھا۔ ان کے شوہر کا شہر میں جوتوں کا کارخانہ تھا۔ وہ ہفتوں، مہینوں میں چکر لگاتے تھے۔ میڈم کے پہلے دو بچے مردہ پیدا ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے کسی بچے کا منہ نہیں دیکھا۔ اپنی خالی گود کا احساس اکثر ان کی چلوں پر چٹکتا دکھائی دیتا تھا، بظاہر بی بی کو کبھی یہ بچے نہیں چل سکا تھا کہ میڈم اولاد کی کمی پر کتنے آنسو بہاتی ہیں ان کے شوہر فرقان کتنے مضطرب ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اولاد کی کمی ضرور ہے پر وہ کسی دشمن کا باعث نہیں ہے لیکن بچھلی مرتبہ دروازے کے لیے جب وہ گھر آئے تو کمرے کی صفائی کرتی بی بی سناٹے میں آ گئی۔ دوسرے کمرے میں وہ میڈم پر تیر برسا رہے تھے۔

”کیا ہے تمہاری قابلیت، ایک بچہ تو پیدا کر نہ سکیں۔“

”اس میں سیرا کیا اختیار ہے فرقان۔“ جواب میں حیدر جیکر کی جھکی جھکی آواز آئی۔

”تو ٹھیک ہے، نہ میں بوڑھا ہوں، نہ بیمار۔“ فرقان صاحب کی گونج دار آواز نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا اور وہ تپ اٹھی۔ بابی بالی کی بات یاد آ گئی۔ وہی بات اس نے فرقان صاحب کے شہر جانے کے بعد اداسی میڈم کے سامنے بیٹھ کر سنائی۔

”یہ طاقت صاحب کی اصلیت ہے، آپ ان کے راستے میں نہ آئیں یہ روند ڈالیں گے۔“ میڈم نے سر دو طویل اور بھری اور کیبل میں منہ چھپالیا۔

کئی روز اس کے دل و دماغ پر اس واقعے کا اثر رہا۔ پھر چند دن کے بعد وہ کچھ بھول گئی، میڈم بھی معمول کے مطابق سکول کے کاموں میں مصروف ہو گئیں، بچیوں کے ششماہی امتحان ہو رہے تھے، جس وجہ سے چھٹی جلد بورے تھی، وہ بھی معمول سے پہلے فارغ ہو جاتی تھی۔ آج دھوپ بھی سنہری تھی، وہ دروازہ پر کھڑی ہو کر میڈم کے پاس آ بیٹھی، سردی سے ٹھٹھرتے جھروں پر دھوپ پڑی تو جان سی پڑ گئی۔ بابی بابا نے خوش ہو کر اسے دیکھا۔

”آج تو جلدی فارغ ہو گئی ہو۔“

”ہاں! میڈم نے چھٹی دے دی۔“

”اچھی بات ہے تو جلدی سے گھر جا اور گھر والے کو خوش کر۔“ بابی بابا نے شوق سے کہا تو وہ بہت دکھ سے ہوئی۔

”مرد کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔“ ایسے کہتے ہوئے اس نے بیٹکی پکوں کے کونے ان سے چمپالے۔

”کیا تیرا گھر والا بھی.....؟“ بابی بابا نے حیرت سے پوچھا۔ تو وہ کمال ہوشیاری سے ٹال گئی۔

”اس کی تو بات ہی چھوڑ دو، وہ معذور ہے، اس نے کیا خوش اور کیا ناخوش ہوتا ہے۔“

”تو پھر کس کی بات کر رہی ہے۔؟“

”صاحب کی، وہ ناخوش ہیں میڈم سے بہت ناخوش ہیں۔“ وہ ناچاہتے ہوئے بھی افسردگی سے کہہ گئی۔ ان کے ہاتھوں کی حرکت میں رتی برابر فرق نہیں آیا، بلکہ انہوں نے اس بات کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا تو وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔ انہوں نے کیاری کے سچے سے فالتو پیدا ہو جانے والی جنگلی جڑی بوٹیاں اس کی کھینچ کر نکالیں۔ اس پر قطعاً توجہ نہ دی۔ وہ بھی چپ سی ہو گئی، کافی دیر بعد وہ کام ختم کر کے ہاتھ چھالتے ہوئے ہوئے۔

”اوائے بی بی! تم اپنے بندے کا علاج کسی بڑے ڈاکٹر سے کیوں نہیں کراتیں۔ وہ تو دن رات مجھے پر پڑا پڑا کاروبار بن گیا ہوگا۔“

”ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے۔“ بیڈ انٹی معذور ہے۔“ وہ بڑے لالبا لی پن سے ہوئی۔

”پیدا انٹی معذور سے تیری شادی کس نے کر دی؟“

”ناخوش میرے لہانے۔ وہ بھی مجھ سے اور میری ماں سے ناخوش تھا۔“ ایک دم ہی اس کا لہجہ ہر آواز ہو گیا، اور وہ سر سے ہیر تک کر لیے کی تیل بن گئی۔

”تو کب تک اس کی خدمت کر لگی۔ زمانے کی سردی گری برداشت کرنے کے لیے سخت پنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو تو ابھی بالکل بچی ہے۔ چار دن تان لینے سے کوئی چھپ توڑی جاوے گی۔“ وہ بولے۔ مگر وہ بنا کچھ کہے ان کے پاس سے اٹھ کر سکول کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ بازار سے گزرتے ہوئے فوراً ہی اسے بابی بابا کی بات کی سچائی کا سامنا کرنا

پڑا۔ جس سلوہزی والے سے ایک پاؤں آلودہ آدھا پاؤں ٹھرتوئے کو کہا تو بالکل اس کی طرف جھک کر آلو تو لے ہوئے دھیرے سے بولا۔

تو بھدھار سے کام لے تو سبزی کی نوکری دروازے پر پہنچا دیا کروں گا، کیوں اپناج کے لیے کانٹوں پر چل رہی ہے۔“ وہ غصے سے اے گھور کر رہ گئی تھی اس کی طرف پھینک کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ غلطی سے قادر کو بتا بیٹھی تو رات بھر درد سے جھنجھکیاں پیلوں کی وجہ سے سو نہ سکی۔

اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس طرح کے حالات و واقعات میں دھیرے دھیرے اضافہ بجلی کے چھوٹے موٹے سامان کی دکان کا اضافہ، جس پر دیسی نما شہری بد شکل نوجوان لال پتلی شرت لگے میں رہنمی رومال باندھے فلمی گانے چلا کر ہر وقت سن چلوں کی بھیمزئی لگنے لگتا۔ جانے کہاں کہاں کے کارے کارے فرمے ہوئے شروع ہو گئے تھے۔ اس کو قدم اٹھانے دشوار لگتے تھے۔ جو نبی قریب پہنچتی تو ایک دو فلمی گانے لہک لہک کر ادھنی آواز میں گاتے۔ قادر کے درد کی گولیاں لینی تھیں۔ اس کو اکثر ریڑھ کی ہڈی میں درد ہو تا تھا تو گولی کھانے سے سکون مل جاتا تھا، باقی تو اس بے جان ٹانگوں کا کوئی علاج نہیں تھا، وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہتا تھا۔ یہ بات تو شادی کا لال جوڑا پہنچتے ہوئے اس نے سن لی تھی۔ سفاک ہا دس ہزار جیب میں اڑوٹے ہوئے قادر کے باپ کو اس کے صبر اور حوصلے کی کہانیاں سناتا رہا اور تسلیاں دیتا رہا۔ وہ قادر کی بے جان ٹانگوں سے رشہ جوڑ کر کچھ عرصے شہر میں دھکے کھاتی رہی۔ اب تو اسے بیاہ کر کرانچا گیا یاد آتی ہے کچھ پتہ نہ چلا، شہر سے بھوک افلاس اور کرائے کے مکان سے چھٹکارہ حاصل کر کے اپنی ماں کے نام کے دو درملے کے مکان میں آگئی۔ یہاں قادر کی خدمت اور درد و دقت کی روٹی کے لیے رات دن سرزد گرم حالات کا سامنا کر رہی تھی۔

اس نے چھوٹی سی برائے نام دو تینوں کی دکان سے گولی خرید لی چاہی تو ان کے پاس گولی نہیں تھی، وہ تھک ہار کر واپس آگئی۔ قادر کے درد کی شدت نے غصے کی شکل اختیار کی اسے پاس بلا کر کلکڑی کے ڈنڈے سے دھکک ڈالا۔ وہ چل کر، یا تھک کر تو نہیں جاسکتا تھا اس لیے اسے پاس بلا کر سر ہانکے رکھے ہوئے ڈنڈے کا استعمال کر کے اپنی مردانگی کو تسکین دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ہانکے کے بعد اسے کچھ احساس شرمندگی ہوا تھا۔ ڈنڈا درد سے دور پھینک کر

اس کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچتے ہوئے کہا۔

”تو یہ ڈنڈا کیوں میرے پاس رکھتی ہے؟“

”تاکہ تجھے غصہ آئے تو، تو معذوری محسوس نہ کرے۔“ نوحا بدن ہاتھوں سے دباتے ہوئے اس نے جواب دیا تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ ابا تھک زور زور سے پٹک کی پٹی پر مارنے لگا۔ ”نہ، نہ کرو ایسا، شوہر کی اطاعت، خدمت بیوی کا فرض ہے“ اس نے رندے ہوئے گلے سے سکون بخش احساس اس کے ذہن میں ڈالا وہ آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اس وقت بھی وہ آنکھیں موند کے احساس جرم چھپا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے روٹی پکانے لگی۔ روٹی پکاتے ہوئے بھی آنکھوں سے مسلسل برسات جاری رہی۔ صبح اس برسات کا اثر تھا کہ سب نے سکول میں اس کی سرخ سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ استانیوں نے پوچھنا چاہا تو وہ سکرا کے ہال گئی۔ میڈم کے اپنے گھر میں کشیدگی چل رہی تھی، فرقان صاحب آئے ہوئے تھے۔ وہ جلدی اٹھ کر گھر چلی گئی تھیں، مانی بابا نے البتہ اس کو نکلے سے ہالٹی میں بانی بھرتے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ رک کے نکلا چلاتی ہے، ایک ہلکی سی کراہ اس کے حلق سے نکلتی ہے۔ وہ پاس آگئے اس نے ہاتھ سے پرے کر کے خود پانی کھینچ دیا۔ وہ ہالٹی اٹھانے کو بھی تو درد سے آہ بلند نکلتی گئی۔

”بی بی! تجھے پتہ ہے، گیلی ٹاپلی کی کلکڑی کے کھڑکیاں، دروازے، چنگ، چوکیاں سوکھنے پر کیسی آواز دیتے ہیں؟“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”بالکل تیرے جسم سے اٹھنے والے درد کی آواز جیسی۔“ وہ سنجیدگی سے بولے اور ہالٹی اٹھا کے سکول کے باورچی خانے میں لے گئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ چلتی ہوئی وہیں آگئی، چائے بناتی تھی، چائے کے گندے برتن دھوئے تھے وہ کچھ کہہ نہ سکی، کیونکہ چڑا اسی آگیا، اس نے بتایا میڈم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، صاحب کہہ رہے ہیں بی بی لی کو سمجھو۔ وہ یہ سن کر جلدی سے چادر کے پلو سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ، دیکھو کھڑکی سے باہر دیکھو، باہر تنگی اچھی دھوپ پھیلی ہے، موسم بدل رہا ہے، لیکن بولتے موسم میں اپنا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے تمہارے شوہر کے لیے بڑے اچھے حکیم صاحب کا پتہ کیا ہے، کسی روز چھٹی والے دن سے ملیں گے۔“ وہ غیر ضروری، غیر متعلقہ باتیں کرتے چلے گئے۔ وہ حیرت سے منہ نہک رہی تھی۔ ”میڈم پر بھی وقتی بدلتے موسم کا اثر ہے،

”یہ کیا ہے؟“

”تھیں کام میں غفلت، بنا اطلاع کے چھٹی کرنے کے کوتاہی پر نوکری سے فارغ کر دیا گیا ہے“ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنا سخت لہجہ اختیار کیا کہ اسے یقین نہ آیا۔ بلکہ لگا کہ وہ کسی سے ایسا لہجہ ادھار مانگ کر لائی ہیں۔ وہ منہ کھولے یقین کرنے کی کوشش میں تھی کہ وہ قائل کھول کر اس پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئیں۔ بی بی کے دل کو دھچکا سا لگا تو اس کے دہکی دل نے میڈم کو پچھاننے سے انکار کر دیا۔ وہ ہنگامی چوک کے ساتھ باہر نکل آئی۔ گلوں کو پانی دینے ہوئے مانی بابا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ ان کی حیرت دور کیے بغیر ہی گھٹ تک آگئی، چونکدار نے خامسے دکھ سے دیکھا تو وہ مسکرا کر گھٹ عبور کر گئی۔ دو ستارے ٹوٹ کر سفید لفاظ نے میں جذب ہو گئے۔ اپنے ناکرہ جرم کی سزا سینے سے لگائے وہ بار بار یہی سوچتی رہی کہ اس کا قصور کیا ہے؟

مگر دو دن اسی شش و پنج میں، اذیت و ملامت میں، گزر گئے۔ قادر نے بھی نوکری کی سہولت ختم ہونے پر خوب غم و غصہ نکالا۔ وہ ڈیڑھ سو ڈیڑھ سال سے اسکا ساتھ بھارہا تھا اس رات داغ مفارقت دے گیا۔ بی بی کی اندوہناک چیخوں نے اسے یقین دلایا تو اسے یقین آ گیا۔ اب کی بار جسم پر خامسے زخم بھی آئے تھے۔ وہ کپڑا پانی میں بھگو کر زخم صاف کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سن کر وہ چادر اچھی طرح پلیٹ کر دروازے تک آئی۔ بند دروازے کے پیچھے سے پوچھا۔

”کون ہے؟“ تو میڈم کی آواز آئی۔

”میں ہوں حمیدہ۔“ اس نے احترا میں جھٹ دروازہ کھول کر انہیں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا، ان کے ساتھ چیز ای عطا محمد تھا۔ وہ اندر آگئیں۔ چند لمحوں کے نیم تاریک سلیں زندہ کرے کو دیکھا، جس میں نہ ہوا کا گزر تھا اور نہ روشنی کا۔ بلب کی زرد روشنی میں میبلے سے نکلے پر سر رکھے قادر لیٹا تھا۔ اس کے پانچوں میں پرانی لوہے کی بائلی رکھی تھی جس میں شاید گندگی جمع تھی۔ ناگوار بد بو اور گھٹن میں وہ زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے اپنے انداز سے انہوں نے سمجھایا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر قادر کی طرف بڑھیں اور بولیں۔

”بی بی کی تم سے زیادہ مجھے ضرورت ہے“

”تمہاری ضرورت اس میں ہے۔ سوچ کر فیصلہ کر لیں.....“ وہ بالکل اس طرح کا سفید لفاظ قادر کے ہاتھ میں دیکر مڑیں، وہ اب تک دروازے پر کھڑی تھی۔ انہوں نے کچھ نم آلود گناہوں سے اسے دیکھ کر فقط اتنا کہا۔

”میرے قادر کے پاس طاقت ہے۔“ وہ راستہ بنا کر باہر نکل گئیں اور وہ ہوتی بنی دروازے سے باہر دور تک انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد اندر آ کے دیکھا تو قادر بہت سارے نیلے نوٹ گن رہا تھا۔ سفید لفاظ اس کے سینے پر رکھا تھا۔ اس کی نحویت کا عالم دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔ اسے قادر کی جگہ جیب میں نوٹ اڑھتا ہوا با نظر آنے لگا، اور میڈم کی مجبوری بھی سمجھ میں آگئی۔



کی سی چھرتی سے اشارہ کھینے کے دوران سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ ناصر قلفی والے کی باجیس کل گئیں۔ وہ فٹ ہاتھ پر چوڑا مار کر بیٹھے گی تو ناصر نے اپنا لوہے کا اسٹول فوراً کندھے سے اتار کے صاف کرتے ہوئے پیش کیا، اس کی پیشانی پر سولیس ابھریں، جل کر بولی۔

”چل اوئے! تو سب کو قلفی بیچتا ہے، مجھے قلفی سے پہلے اسٹول کیوں دیتا ہے؟“
”جھجھ میں اور دوسروں میں بہت فرق ہے۔“ ناصر نے اپنے پیلے پیلے دانٹوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”چل چل۔“ کم کر اپنا، مجھ فقیرنی کو چکر دینے کی ضرورت نہیں، چل قلفی نکال۔“ وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں حکم سے کہہ کر سامنے رکے والی موٹر سائیکل کو دیکھنے لگی۔ ناصر نے جلدی سے جیس روپے والی قلفی کھوپرے بادام کی تہہ چڑھا کر اسے تھما دی، قلفی پر زبان بھیرتے ہوئے بولی

”اس بن بلائے مہمان کو ایک قلفی کھلا۔“ ناصر نے کچھ حیرت اور کچھ بیزاری سے موٹر سائیکل پر بیٹھے معقول سے آدی کو دیکھا جو کسی طرح سے بھی اس کی ذات برادری کا نہیں لگ رہا تھا۔

”اوئے۔ منہ کی تیک ریاں اے قلفی بھڑا باؤ سوہنے نوں۔“ وہ ادا سے خاص انداز میں بولی تو ناصر قلفی والے نے جیسے پیٹے چھو لیے۔ اے وہ معقول آدمی ختم ہوا گا۔“
”بھونہ۔ باؤ سوہنے نوں۔“ وہ منہ میں بڑ بویا تھا مگر اس نے سن لیا۔

”کیوں جل گیا؟“ قلفی بھڑا۔“ اس نے غصے سے کہا، ناصر قلفی والے کے ہاتھوں میں ناگواری جنش ہوئی مگر اس نوجوان نے قلفی کھانے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر ”مجھے قلفی نہیں چاہئے، تم سے دو باتیں کرنی ہیں۔“ قلفی والے کو دلی طور پر اس کے انکار سے جو خوشی ہوئی تھی وہ اضطراب میں بدل گئی۔

”دیکھ باؤ۔ پورے اک مہینے سے میں تری آئیاں جانیاں دیکھ رہی ہوں، میں نہ کسی کی سنتی ہوں نہ شانی ہوں۔“ چل بھٹ۔“

”بات تو تجھے سنتی پڑے گی۔ میرے ساتھ چل، کہیں اور چل کے سن لے۔“
اس کا انداز بڑا مستحکم اور ثابت قدمی والا تھا۔

چوک چوراہوں پر لال، بجلی ہری بتیوں کا کھیل بھی بہت زندگی سے بھرپور ہوتا ہے، اشارہ بند ہو تو بھاگتی دوڑتی گاڑیاں ایک دم بڑھیاں رگڑنے لگتی ہیں، اس وقت ہر ایک سوار کی نظر ان بتیوں پر ہوتی ہے مگر شہر کے سب سے بڑے چوک کی خصوصیت جہاں نہیں تھیں۔ یہاں اشاروں پر پابندی نیاز مند سی سمجھ کر کی جاتی تھی، یہاں رکنا اور مستقل رکے رہنے کی آزادی جاتی تھی، ہر ایک کی نظر بھاگتی برقی رفتار رانی پر ہوتی تھی کہ وہ پہلے اس کے پاس آ کر اپنا گورا چٹا ہاتھ پھیلائے۔ کہیں اشارہ نہ کل جائے اور وہ اس حسین چہرے کی سنہری دھوپ سے محروم نہ رہ جائے۔ سب دل علی دل میں یہی دعا کرتے تھے کہ اشارہ مستقل بند ہو جائے اور انہیں اس چوک سے اور کہیں نہ جانا پڑے۔ شہر کا معروف و معروف چوک رانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا چلنا ادا سے سڑنا، جھکنا اور ہاتھ پھیلا ہوا مختلف تھا، شاید اس جاہل نوار کو کسی نے دانشمندی کا یہ بات بتا دی تھی کہ زندگی تو انفرادیت سے ملتی ہے۔ وہ اسی نئے پر عمل کر رہی تھی۔ جب ہاتھ پھیلاتی تو کوئی پانچ روپے کا نوٹ ہتھیلی پر رکھ دیتا، کسی کو وہ سو پچاس کے قابل نظر آتی، کوئی پانچ سو، ہزار کا نوٹ دے کر بھی شرمندہ سا ہوتا۔ مگر اسے صرف پانچ، دس کے نوٹ سے مطلب اور دلچسپی تھی، بڑے نوٹ تو بڑی بڑی کے ساتھ لپیٹ کر دینے والے کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ یہ بھی اس کی انفرادیت تھی، صاف تھری، سلجھے سلجھے بالوں والی دل لوٹنے کا فن جانتی تھی، اس سے زیادہ اس کی ناک میں جھگکا ستارہ نما کوا بجلی بن کر دلوں پر گرتا تھا۔ مگر اسے کسی متاثر سے کبھی کوئی بھردری یا آشنائی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھاکارن تھی، دونوں ہاتھوں کی مٹھیں میں ہیک کی پرچیاں جمع کرتی تھی۔ اس وقت بھی دونوں ہاتھوں کی بھری مٹھیں کو دوپٹے کے پلو میں بٹکا کر کے بجلی

”تراد ماگ کھراب تے محیں، کیوں اپنی عزت کھراب کر رہا ہے۔“ قلعی قسم کر کے دوپٹے سے منہ اچھی طرح صاف کرتے ہوئے وہ بڑی سادگی سے بولی

”تو میری بات سن لے تاکہ میرا مطلب سمجھ جائے۔“

”میں کیوں سنوں؟ توں پاگل تے محیں، اپنا میرا فہم خراب نہ کر۔“ وہ خاصی ترشی پر اتر آئی۔ تو وہ چند لمبے اسے شاکی نظروں سے دیکھتا رہا پھر تیزی سے موڑ سائیکل لے گیا۔

”یہ کوئی نیا تکبیر و لگتا ہے۔“ ناصر نے جملہ بھنے لہجہ میں کہا۔

”تیرا مطلب؟“ اس نے خشمگین نگاہوں سے گھور کر اس کا مقام یاد دلایا۔

”مجھ سے تو میرا مطلب ہے نا۔“ وہ منمنایا۔

”کیا۔ کیا مطلب ہے، یہ بکڑ قلعی کے پیسے اور اپنی کوڑے ورگی آنکھیں نہ گھما۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے بہت سے مڑے تڑے نوٹوں میں سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اس کے منہ پر مارے۔ وہ کھسکا سا ہوا کر بولا

”تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے، میں تجھے اپنے گھر کی شہزادی بنا کر رکھوں گا۔“

”آخ قہو۔! ایسی شہزادی جو دودھ کاڑھے کاڑھے ترے بچوں کی فوج تیار کرے گی، جو شہر کے چوک چوراہوں پر قلعی کی ریڑھیاں کھینچے گی۔“ اس نے ناک منہ پر ہار کر زہریلی نظروں سے دیکھا اور اس کی اوقات یاد دلوا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، رانی کا روزمرہ کام معمول تھا، ہر روز وہ کسی نہ کسی کو لٹاؤ کر بے عزت کرتی تھی مگر ناصر قلعی والا اس عہد کا پابند تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ رانی کو اپنے گھر ضرور لے جائے گا۔ مگر رانی منٹوں میں اس کی قلعی اتار کے اس کے فنِ تہیہ کے سب عجیب دکھا دیتی۔ مگر وہ برا نہیں مانتا تھا، اسے وہ بہت اچھی لگتی تھی، اپنی سکنہ پھوپھو کی عالیہ سے کئی گنا اچھی، عالیہ کے نام کی مضافی کھانے کے بعد بھی وہ عالیہ کا نہیں ہوا تھا، اس کو ہر گھڑی ہر چل رانی ہی نظر آتی تھی جبکہ رانی جیسے ہی قلعی سے دودھ کھوئے کے ڈالنے کا آخری احساس کشید کر کے خانی بچکا بیٹھتی تو وہ اسے بالکل یاد نہ رہتا، خانی بچکا بھی وہ ہمیشہ اسے دکھا کر بالکل اس کے سامنے بیٹھتی تھی، کبھی کبھی تو وہ ایسا محسوس کرتا کہ اس کی حیثیت رانی کی نظروں میں اس تنگے سے بھی بدتر ہے۔ کئی بار اس سے پوچھا تھا میں چاہتا ہوں کہ اس نے موقع ہی نہ دیا۔

اس میں رانی کا کوئی قصور نہیں تھا، اس نے ہاتھ پھیلائے کیلئے جس جھٹکار کا استعمال کیا، وہ اس کا حسن ہی تھا، اپنی برادری میں وہ اکیلی کسی اور دنیا سے آئی لگتی تھی، کہاں سے آئی تھی؟ کون لایا تھا یہ اس نے پالنے والے مکھن چاچا سے بھی کبھی نہیں پوچھا تھا۔ کئی بار مکھن چاچا نے اسے کچھ کہنا بھی چاہا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی

”چاچا! رانی آ جاد (آ آزاد) ہے سورج کی کرناں داگھوں، کون جانے کرناں کہاں سے آئیاں؟ ایسے میں چاچا کالی بھجنگ جائے میں سہل زدہ پاپے بھگو کر اسے رانی بننے کی دعا دیتا۔“

”اوئے کھلی اے! اللہ بخت لاوے تو رانی بن کے راج کرے۔“

”ہونہ۔“ راج اور حکومت اپنے ہتھ کی ہوتی ہے چاچا۔“ وہ یہ کہہ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں سرے کی سلائی پھیرنے لگتی۔

”تری کمانی کا اک اک پائی پیہہ فھونج (مخلوط) ہے، تو برادری کے منڈوں (لوگوں) پر نجر (نظر) ڈال کے بتا۔“ چاچا مکھن، اپنی اکھڑی سانس کے ساتھ نورانی یہ کہتا تو وہ جمل جاتی۔

”ایسی کی تھی برادری کے منڈوں کی۔“

یوں بات آتی گئی ہو جاتی، اس نے زندگی کے تھیس سالوں کا سفر بیک مائیکس، مکھن چاچا سے لڑتے جھگڑتے گزارا تھا۔ اسے کوئی پرواہ نہیں تھی روز اس کے راستے میں بہت سے مرٹنے والے آتے تھے مگر جانے اسے کس کی تلاش تھی؟ یہ سوال وہ اکثر دیشتر رات چٹائی پر لیٹ کر جتنی بیٹوں کے ساتھ خود سے پوچھتی تھی۔ لیکن کوئی جواب نہیں آتا تو صبر شکر کر کے سو جاتی۔ اسے یہ کمال حاصل تھا کہ جیسے ہی سو کر اٹھتی، سب کچھ بھول چکی ہوتی، ہنسی مسکراتی نہا دھو کر تیار ہوتی اور بیک مائیکس نکل جاتی۔ گندیشا ایک ماہ سے وہ اس شخص کو روز کل، روز بھولنے کے عمل سے گزر رہی تھی مگر آج صبح جب اٹھی تو وہ اسے پوری طرح یاد تھا، اس کا چہرہ مہرہ، آنکھیں، ہونٹ، سب کچھ یاد تھا۔ وہ گزری کل جس ادا سے رخصت ہوا تھا اس نے اسے یاد رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسے یاد کرتی ہے خیالی میں گلی سے نکل کر سڑک کی طرف آئی تو زن سے اس کے سامنے اپنی موٹر سائیکل سمیت آ موجود ہوا۔ وہ اچھل کر ڈاسا پر سے ہو گئی، وہ آرام سے موٹر

سانیکل سے اتر کر اس کے پاس آ کر بولا۔

”رانی! تجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تیرے لیے اچھا سوچتا ہوں، تیرے لیے اچھا چاہتا ہوں اور“ ”اوائے ہوئے! بس بس کدھرے فٹنی گانا نہ گائیں باؤ۔۔۔۔۔ مجھے بڑا سکھت (خست) غصہ آتا ہے عاشق بازوں پر۔۔۔۔۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں ترتر کا بولی۔
”نہیں۔۔۔۔۔ میں گانے گانے والا عاشق نہیں، تو ایک بار میری بات تو سن لے۔۔۔۔۔“
وہ عاجز آ گیا۔

”اچھا بول۔۔۔۔۔ اب تو دل کی بجز اس نکال لے، روج روج میرا نیمہ کھراب کرتا ہے، بول بتا، وہ اچھل کر اس کی موٹر سانیکل پر بیٹھ گئی۔ وہ جڑ سے چاروں طرف آنے جانے والوں کو دیکھنے لگا، دراصل وہ اس سے کسی اور جگہ بات کرنا چاہتا تھا، مگر وہ قید و بند سے آزاد تھی، وہیں بھج گئی، مجبوراً وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
”رانی۔۔۔۔۔ تو بہت اچھی ہے، تو بیک مالٹا چھوڑ دے، بیک مالٹا اچھی بات نہیں“ وہ بشکل تمام چند لفظوں کو ترتیب دے دے گا تو اس کے حسین چہرے پر سارے جہاں کا تسخیر آ گیا۔ وہ دیر تک مستحکم انداز میں ہنسی چلی گئی۔ پھر کالی چڑی کے پلو سے گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بڑی سادگی سے بولی
”بہت خوف۔۔۔۔۔ سارا مکمل پانی کرادیا ہاں۔۔۔۔۔ یہ فعل (فضول) بات کرنی تھی“
”یہ فضول بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ تجھے برا نہیں لگتا کہ لوگ تجھ پر بُری نظر ڈالتے ہیں، تجھے غمور تے ہیں،

”اور تو، تو اپنی گل کر باؤ، اوئے تو تو اوسر تک آ گیا اے۔۔۔۔۔ تری نظر میرے تے نہیں اے“ اس نے الٹا اس سے سوال کیا۔ وہ کچھ گڑبڑایا مگر پھر نہیں سہیا۔
”میری نظر میں تیرا وہ احترام ہے جو کسی اور کی نظر میں نہیں۔۔۔۔۔“

”ہا۔۔۔۔۔ چل جا! ہو! کچھ نہ کہہ، میری گل سن، بیک مالٹا میری عادت ہے“ وہ بڑی اداسے اسی طرح اچھل کر موٹر سانیکل سے اترتی جس طرح بیٹھی تھی اور اسے یہ تاثر دیتی ہوئی جلی گئی جیسے اس کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔۔۔۔۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

پھر تو اس نے قسم کھائی کہ اس کو بیک مالٹے سے روک کر رہے گا، صبح شام، آتے جاتے، اسی رستے پر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرے گی، مگر وہ رک جاتی اور کبھی کدھار چکا کر چلی جاتی،

ہفتہ بھر اسی طرح ہوتا رہا آخر ایک دن اسے بھر موچ مل گیا، وہ تیرہ قدموں سے چلتی ہوئی آ رہی تھی کہ ایک دم چل ٹوٹ گئی۔۔۔۔۔ اس نے دوپٹے کی کٹی پھاڑی اور چل کو جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ پاس آ گیا۔۔۔۔۔ آج وہ نہ چوکی نہ تیرا رہی سے منہ بنایا۔ بس چپ چاپ دوپٹے کی کٹی سے چل باندھنے کی حالت میں وقفہ وقفے سے اسے دیکھتی رہی۔

میرا نام سلیم ہے۔ میری کپڑے کی دکان ہے۔۔۔۔۔ جانے کیوں آج پہلی بار وہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے چل جوڑنے کے بعد میری ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آج اپنے بارے میں دج کیوں دس ریاں ایس؟“

”کیونکہ آج تیری آنکھوں میں خواہش اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے، آج تو وہی ازلی عورت ہے جو زندگی میں صرف ایک بار پورا پوری جیتی ہے۔۔۔۔۔“ وہ عالم جذب میں گر گیا۔ وہ ایک ملک اسے دیکھتی رہی، چاہے کھنکھوے والا جواب سا نظر آئے گا تھا۔

”رانی! میں چاہتا ہوں کہ میں تیری خواہش بنا رہوں“ وہ اسے چپ دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”پاکل! میری خواہش تو روپیہ ہے، ہر رات آسمان کے تارے گن کر دعا کرتی ہوں کہ کل اتنے نوٹ جمع ہوں۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم چلا ملک مار کر اپنی مخصوص دنیا میں واپس چلی گئی تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تو عورت ہے۔۔۔۔۔ تجھے بیک نہیں چاہئے۔۔۔۔۔ حق چاہئے۔۔۔۔۔“
”بس بس۔۔۔۔۔ سر بھاری ہو گیا اے، سیدھی گل کر“ وہ چڑی گئی۔

”دو باتیں ہیں۔۔۔۔۔ بیک مانگتی چھوڑ دے اور مجھ سے شادی کر لے۔۔۔۔۔“ وہ بے ساختہ کر گیا۔ یہ سن کر اس نے کانوں میں پڑی سونے کی پالی زور زور سے ہلائی اور اپنے رستے پر آگے نکل گئی۔

سلیم اچھ کا سوال کئی ہفتے سولی پر چڑھا رہا، وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر اپنا کاروبار، اپنی زندگی سب کو بھول بھال کر اس کی راہوں میں بھگ رہا تھا مگر اس نے جانے کون سی چپ کی شراب پی لی تھی کہ وہ اس کے قریب سے بنا دیکھے آٹھیں چڑھائے آگے گزر جاتی۔۔۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی یہ تو وہ نہیں جانتا تھا، کیوں اس کی اداؤں میں ضمیر آسا آ گیا تھا، کیوں بائچن میں حجاب سا آ گیا تھا؟ بیک مالٹے، فٹنی کھانے کے طور اطوار میں نمایاں تبدیلی آ گئی

”میں نے مشکل بات کہہ دی.....“ وہ مسکرائی

”اوائے جمعی اے، اپنا سیرا درشتہ بچان..... چل جا دیو ہو رہی اے۔“ وہ جس کے بولے۔ وہ سرعت سے باہر نکلی۔ تیز قدموں سے سڑک تک آئی۔ نظرس دامن بائیں بھٹک رہی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ وہ جلدی سے سامنے آ جائے اور وہ اپنے جھکے کی پیروی کر

”نہیں..... اتنی آسان بات کہی ہے کہ ترے مقام پر اسے رکھتے ہوئے نجات دے دوں گی۔“

”ہاں سلیم! کہنا تھا کہ نہ سناؤ، بول میری خاطر پندرہ دن بیک مالگ سکا اے۔“
وہ فیصلہ کن اعلان میں بولی۔ تو اس نے جھپٹ کے اس کا سفید نرم ہاتھ کھینچا اور اپنے مضبوط ہاتھ میں دبا کر کہا۔

”منکھور ہے۔ پندرہ دن بیک مالگوں کا۔۔۔ اور کچھ۔۔۔؟“ وہ یہ سن کر کھل اٹھی۔
”اور کچھ نہیں۔۔۔ اگر میری فرمائش (فرمائش) پوری کر دی تے مویاں ای مویاں۔“

”اب پندرہ دن تو باہر نہ نکلتا۔“ وہ یہ کہہ کر موڑ سائیکل زن سے نکال لے گیا۔
اس کے بعد موسم خزاں کے باد جو اس پر لالہ کے پھول مل اٹھے۔ ہونٹوں پر گلاب مینکے گئے۔ ایک ایک کے خوشبو نہیں تھب تھب لگے۔ تو چاچا کو بہت کچھ پتہ چل گیا۔ اسے صبح سے شام تک بجلی میں اپنی ابھی زلفیں سنوارتے دیکھا تو بہت کچھ سمجھ گئے۔ اس کی خوشی کی خاطر نہ کچھ پوچھا اور نہ کیجھا۔ البتہ برادری میں مکمل سی ٹی گئی۔ باری باری سب کریدنے کیلئے آئے۔ کسی نے پوچھا

”چاچا! خیر تے ہے۔ رانی کو پردے میں چھپا دیا کیا۔؟“ کسی نے کہا
”نہاوا بھیجی۔ بھکری (قیرنی) بھی کھواب دیکھیں لگی اے۔“ شیدے
استرے نے اتر کر سینہ پھلا کر کہا۔

”چاچا! رانی کیلئے میرے سے اچھا کوئی نہیں، اب تو اس کے چھ پیلے کر دے، بڑی جان سے بچتی کی حاجت (حفاظت) کب تک کرے گا“ شیدے استرے کی بات پر وہ تھملا کر رہ گئی، اس کا دل چاہا کہ استرا اٹھا کر اس کی تھل میں بیٹگی بڑی بڑی موٹھیں صاف کر کے اس کی پٹیلی پر رکھ دے۔ بس خون کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ چاچا سے کہا تو انہوں نے کھٹی کھٹی آواز میں ای کو بھیجا۔

”دیکھ پترا! طوفان جب آتا ہے تو اس سے بچنے کی سب کوسمیں (کوششیں) کرنی پڑتی ہیں، بوجہ باریاں بند کر کے طوفان سے محفوظ فیروہیں ہو سکے اور ہماری بجلی تو طوفان کا اک مجموعہ دلی برداشت نہیں کر سکتی۔“ پہلا موقع تھا کہ چاچا کی بات

اسے اچھی نہیں لگی، وہ بُرا سا منہ بنا کر چٹائی پر لیٹ گئی۔ چاچا نے جانے اسے طوفان کہا تھا یا برادری والوں کو۔۔۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ طوفان تو اس کے اندر آیا تھا جس سے وہ کوشش کے باوجود خود کو محفوظ رکھ نہ سکی اور انوکھی سی خواہش کو زبان دے دی۔

چار بجے دن کے بعد برادری والوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔۔۔ چاچا بھی اس کی خوشی کی خاطر خاموش ہو گئے تھے مگر اس سے ناراض نہیں تھے، شورتو اس کے اندر اٹھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔۔۔ دیر میرے لیے ہاتھ پھیلائے گا۔ بے لگی ہی بڑی تو اٹھ بیٹھی۔ جین نہ آیا تو دیر سے دیر سے جا کر لوہے کی صندوقچی سے وہ کپڑے کی پوٹلی سی نکال کر دیکھنے لگی جس میں مکھن چاچا نے اس کی بیک کے تمام پیسے جمع کر رکھے تھے۔ اس نے واپس چٹائی پر بیٹھتے ہوئے پوٹلی کھول کر نوٹ گننے شروع کیے کہ مکھن چاچا نے سرائیہ کر اسے دیکھا اور حیرت سے اٹھ بیٹھے۔ وہ وہیں پیسے دکھ کر ان کے پاس آ بیٹھی، وہ کافی دیر اسے دیکھتے رہے، پھر اس کے سر پر رازنا کا پتہ بھجرا ہاتھ رکھ کر بولے۔

”رانی پتر۔ اپنی جیتی چاریاں تو سب گئی نہ دے، شادش بولی بولی مر، سفر واپس دے لگ جائے فیروہ اپنی چھتیں سامان نہیں باندھنا چاہیہ۔“

”چاچا۔۔۔ میں تے ایہہ دیکھ رہی سی کہ خرچہ پانی چل سکدا اے کہ نہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی

”تو بھکری ہی نہ کر۔ صندوقچی بند کر کے سو جا، کل سے میں کھود جاواں گا۔۔۔“
”تو۔۔۔ چاچا۔۔۔ نہیں۔۔۔ اے کس طرح ہو سکدا اے۔۔۔“

”اوئے کئی اے۔ تری اڑان ان کے دن آن والے آ گئی۔ میری بھکری نہ کر دے یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ تو وہ کافی دیر گم سم سی بیٹھی ان کے چہرے کی سلوٹوں میں اپنے بچپن سے جوانی تک کا سفر دیکھتی رہی۔ وہ سو گئے تو اٹھ کر اپنی چٹائی کی طرف آ گئی۔ پوٹلی صندوقچی میں رکھ کر بند کی۔

مکھن چاچا نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ اگلی صبح جواز جوڑ کے تمام توانائیاں انہوں نے خود کو اکٹھا کیا اور چائے کی خالی پیالی رکھ کے اس سے بنا کچھ کبے باہر کا رخ کیا۔ وہ کافی دیر بڑا ملاحظہ سے چٹکی سے باہر نکل کر انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ وہ دیر سے دیر سے سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ جب نظر آتا بند ہو گئے تو وہ بھٹی کے اندر آ گئی۔

”اچھے قصور..... اور ہماری برادری.....“

”کیسی برادری؟ میں تو بھٹکا بھٹکا تپے یارو مددگار قصور سے لاہور آیا.....“

”جیسے ٹیشن دے کچھ کچھ کچھ دے میرے تری آواز نے ہیری راہ ڈک لئی..... تینوں سینے نال

لایا..... اوس دن توں، توں میرے نال تے میں تیرے نال..... وقت دی مجبوری نے بھکاری

بنادتا..... بھکاریاں دی ہستی وچ پناہ لکھ گئی..... اے سارے ساڈی برادری بن گئے..... میں

معراج دین سے کھن چا چا بن گیا تے توں تے ہے ای سی رانی.....“ کھن چا چا نے اتنا بڑا

استحان دیا اور آج اتنے برسوں بعد تنبیہ سامنے آیا..... وہ ہکا بکا رہ گئی..... چلیکس بیگ گئیں.....

اپنی خوش قسمتی اور کھن چا چا کی بد قسمتی پر پھوٹ پھوٹ کے رودی..... وہ تڑپ اٹھے.....

”اؤئے پاگل..... رون والی کپڑی گل آئے، بس ایسی قصور جاڈ کے، سارے مسئلے

مسائل ٹھیک ہو جان (جائیں) گے..... بس توں سانہ باندھ لے.....“ انہوں نے اسے سینے

سے لگا کر کہا..... تو وہ جھٹکے سے الگ ہو گئی.....

”نہیں چاچا ابھی نہیں..... مجھے آزما لین دے، پہلی اور آخری وار میں کسی نوں کچھ

کہیا اے.....“ اس کے لہجے میں بے قراری کی تڑپ ہی تڑپ تھی.....

”نا..... نا آ زما، تیرے کول تیری بچپان وی نہیں رہی..... دیکھ دیکھ دیکھ.....“

”نہیں چاچا..... کچھ دن.....“

”تو اس گوشت دی بوٹی نوں بچپان نہ سکی..... او جپ دی بوٹی نہیں سی.....“

”نہ سکی..... میں اپنی جپ دی گل کیہویں موڑ دوں.....؟“

”تیری مرضی ہتر.....“ کھن چا چا نے کہہ کر خاموش ہو گئے..... اور وہ ادھر بن میں

گرفتار ہو گئی..... بہت کچھ سوچتے بھٹتے رات بیت گئی..... جانے وہ جیسی تھی یا بھاری، یہ فیصلہ ہونا

ابھی باقی تھا.....

اگلی صبح وہ انگلیوں پر دن گن کر چٹائی سے اٹھی پورے ستر دن گزر گئے تھے..... آج

اکہتر واں دن تھا..... اس نے کھن چا چا کو چائے اور پاپوں کا ناشہ کرایا اور خود بھی چائے پی کر

تیار ہو گئی..... کھن چا چا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں آنکھیں اپنا

ارادہ بتا دیا..... وہ ایک بار پھر اس کی خوشی کی خاطر چپ ہو گئے مگر جب وہ باہر نکلے کوئی تو اسے

پاس بلا کر کہا.....

”اب تجھے اتنی بیک نہیں ملے گی، تو وہ نہیں رہی، پریشان نہ ہوئیں، کوئی تیرے

دل پلٹ کے نہ گئے اتنی تری تلی تے پیر نہ رکھے تے بھج جائیں محبت دی رسم پوری ہوئی.....

جا، شاد ہمت کر.....“ اسے پیچھے کا کہہ کر انہوں نے اپنی آنکھوں کے نم آلود گوشے صاف کیے

..... وہ باہر نکل گئی.....

کھن چا چا نے جاک کہا تھا..... واقعی وہ بدل گئی تھی..... اس کیلئے زمانہ ستر دنوں میں

بدل گیا تھا..... ناصر قلفی والے نے اس کیلئے قلفی ضرور نکالی پر بادام کھوپرے کی بچت کے

ساتھ..... وہ دکھ سے مسکراتی تو اس نے ذرا پاس بیٹھ نہ رکھا، منہ بھاڑ کے کہہ دیا.....

”رانی..... اب تو وہ رانی نہیں رہی..... بی بی زوہ مریض لگ رہی ہے، تیرے

ہونٹوں کے گلاب مرجھا گئے ہیں، تیری آنکھیں چمک سے عاری ہو گئی ہیں، اور تیری آنکھوں کی

اداء، تیرے جوبن کی دلکشی وہ بڑے لے گیا ہے..... بھیک مانگ کہیں کا، تیرے قیمتی وجود کو ہرا کے

لے گیا..... میری ان اب کوئی اور کام کر..... تجھے بھیک دینے والے اب تیرے قریب نہیں

آئیں گے.....“ ناصر قلفی والے کے لیے چوڑے بیان پر وہ تھلا گئی.....

”تو..... ٹو تو ایسا نہیں تھا.....“ اس نے نگھورا

”وقت دقت کی بات ہے رانی.....“

”وقت اتنی جلدی بدل جائے گا..... اے میں نہیں سوچا سی.....“

”سوچ..... اب سوچ.....“ وہ یہ کہہ کر برائے نام سی مصروف ہو گیا

..... وہ چند لمبے کھڑی رہی پھر ٹول آئی..... خود کو ٹول ٹول کے محسوس کرتے..... شیشہ

دیکھتے..... واقعی وہ بدل گئی تھی..... بھیک مانگنا بھی بھول گئی تھی..... ایک اقرار نے کالیا پلٹ

کے رکھ دی تھی..... اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا..... نا اسے مقدور بھر بھیک ہی ملتی تھی اور نہ ہی وہ

کافر اداس دکھائی دیا تھا..... وہ دن بدن مایوس ہو کر اپنی ہستی کا خوبصورت احساس کھوئی جا رہی

تھی..... برادری والوں نے جتنا حرام کر دیا تھا..... گھر میں فاقے ہونے لگے تھے، وہ دھیرے

دھیرے اور زیادہ کمالاتی جا رہی تھی..... اس کے انتظار میں کرچی کرچی ہو رہی تھی..... لاکھ کھن

چا چا دیلیوں، تادیلوں سے سمجھاتے، اس کا ذہن یہ سامنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ نہیں آئے گا.....

یہ یہ کہ رانی نے دھو کے شکر کھا لی ہے..... اس کی ضد کے سامنے مزید ایک ہفتے اور کھن

چا چا چپ رہے بلا خبر انہوں نے فیصلہ کن انداز میں اسے چٹنے کو کہہ دیا..... کیونکہ وہ چاہتے تھے

کہ یہاں سے جانے میں ہی رانی کیلئے بھڑی ہے۔۔۔۔۔ ورنہ شاید وہ مکمل مکمل کے مر جائے گی۔۔۔۔۔ ان کے کہنے پر وہ نیم رضامند ہو گئی۔۔۔۔۔ اور پھر وہ آخری بار سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار میں ہاتھ پھیلائے پھر رہی تھی۔۔۔۔۔ اشارہ بند تھا۔۔۔۔۔ کسی کو وہ قابل توجہ نہ لگی۔۔۔۔۔ سیاہ سفید سڑکی، لال، چھوٹی بڑی کئی گاڑیوں کے گزرنے کے بعد ایک دم ہی ایک سیاہ چم چم کرتی بڑی سی گاڑی سے ایک لڑکی نے ہاتھ نکال کر پیاس کا نوٹ اس کی پھٹی پر رکھا تو وہ ہنسنے لگی۔۔۔۔۔ اس لڑکی کے ہاتھ اس کی پیٹھا تھا۔۔۔۔۔ نظریں چرانے کے بجائے ڈھٹائی سے سرکراتا۔۔۔۔۔ وہ لپک کر اس کی طرف لگی۔۔۔۔۔ بالکل برقی رفتار ہوا کی مانند۔۔۔۔۔ اس کی کھڑکی پر جھلی نیم پاگوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

”سليم ياؤ۔۔۔۔۔ سليم ياؤ۔۔۔۔۔ تو چندرہ دن کیلئے گیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے تیرے لیے اک داری جی کر دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ جلدی جلدی بولی

”میں نے بیک مانگی تھی، تو نے شرط میں بیک مانگنے کو کہا تھا نا۔۔۔۔۔“ وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے گردن ہلا دی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ لفظ حلق میں ہی رہ گئے۔ بیک کتنی لٹی ہے یہ تو نہیں بتایا تھا۔ اور کچھ۔۔۔۔۔ وہ متحرانہ انداز میں بولا۔ اسی اثناء میں اشارہ مکمل کیا۔۔۔۔۔ گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔ اس کی زبان پر صرف سليم کے جملے کا آخری لفظ ایک گیا۔۔۔۔۔ ”اور کچھ۔۔۔۔۔ اور کچھ۔۔۔۔۔ اور کچھ۔۔۔۔۔“ سچ سڑک پر نیم پاگوں کی طرح کھڑی وہ بے ہنگم ٹریفک کے شور میں خود سے پوچھ رہی تھی۔

”اور کچھ۔۔۔۔۔“

”اور کچھ۔۔۔۔۔“

کہیں سے اس کا جواب نہیں آیا۔۔۔۔۔ کیونکہ اور کچھ نہیں بچا تھا، انوکھی شرط میں اسے مات ہو چکی تھی۔



دروازہ

چرچہ اہمٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور دبیز قالین کی نری پر بھاری قدم جم گئے، آنے والے نے اپنی سانس بھی روک لی، دھڑکنوں کا طغلم بھی سہم گیا۔ اپنے ہونٹ سیٹھے شاید وہ اس یقین کی گرفت میں تھا کہ اس کی آمد کا احساس نہیں ہوگا یا شاید تیرہ سالوں میں احساس کی کیفیت پر دھند چھا چکی ہوگی، مگر وہ حیران اور شرسار ہو گیا اس نے تو جائے نماز پر قبلہ رخ بیٹھے بیٹھے پتا گردن گھمائے، بنا سوال کیے، بنا پوچھے ہی اسے پہچان لیا۔

”دعادت ملی! اکھڑی سے آتے ہوئے تو کبھی اتنے خاموش نہیں ہوتے تھے۔ آج دروازے سے داخل ہو کر اتنے خاموش کیوں ہیں آپ؟“ غرمت نے جائے نماز پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ تب بھی قدموں میں جھنجھٹ نہ ہوئی صرف زبان ملی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوں اور یہ دروازہ کیوں کھلا تھا پوری کوٹھی میں ایشی آباد ہیں پھر بھی کمرے کا دروازہ کھلا تھا، میری جگہ کون؟“

”دعادت! غلٹ نہ کرو کہ اس پر میرا حق ہے مگر یہ حق کیا کسی میں نے استعمال کیا؟“ اس نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

”پھر یہ دروازہ کیوں کھلا تھا؟“

”کہا تو ہے کہ شک نہ کرو، آؤ بیٹھو اور یقین رکھو کہ تیرہ سال پہلے جس کو دلہن کے لباس میں پتا چھوئے، بنا جرم کے سزا میں کمرہ بند کر گئے تھے۔ وہ اب تک اس کمرے میں بند ہے جب تک تمہارے والدہ جات تھے تمہاری عزت کا بھرم رکھنے کے لیے دروازہ بند رکھتی تھی۔ اب جب وہ نہیں رہے تو کوٹھی میں موجود کرایہ داروں سے کیا لینا دینا؟ دیکھو کھڑکی بھی کھلی ہے آپ کو کھڑکی سے صبح سویرے آنے کی عادت تھی تو میں نے ہر صبح کھڑکی کھول کر آپ کا انتظار

کیا اور ہر رات کھڑکی سے ہی آپ کو کسی غیر کے لیے رخصت کیا۔ یاد ہیں ناں آپ کو وہ شادی کے ابتدائی دنوں کی راتیں! جب مہندی لگے ہاتھوں سے کھڑکی کھول کر آپ کو بھیجتی تھی اور ہر صبح اخبار آنکھوں کو صاف کر کے کھڑکی سے اندر آنے کا موقع دیتی تھی۔“

”گھڑی باتوں کو جانے دو۔ اور۔“ وہ دہیں دردازے میں جیسے قدموں کے ساتھ کھڑے رہے۔

”گھڑی باتیں ہی تو میرا اٹا ہے، اس اثاثے کی قدر و قیمت جانتا چاہوں تو دیکھیں سفید ہے جھکن بستر کی چادر کو جو میری محنت و پاکیزگی کی گواہ ہے، جسے میں نے سر کی چاندی سے بنا ہے، یہ کھل وان میں سچے سرخ گلاب مرے لیوں کی سرخی سے بے ہیں، کمرے میں پہلی خوشبو محسوس کرو یہ ایسی دھن کے عروسی لباس کی مہک ہے جسے اُس کا دلہنا نہ چاہنے کی اذیت ناک سزا دے کر کسی من پسند کی ہاتھوں میں رات گزارے۔“

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“ پہلی مرتبہ قدموں میں حرکت ہوئی اور وہ چار قدم اندر آتے ہوئے بولے۔

”ایسا کچھ بھی نہیں جو آپ کی دل آزاری کا سبب بنے۔“ وہ اُن کا ہاتھ تھام کر بیڈنگ لے آئی اور بٹھا دیا خود وہاں ہی کمران کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا معصوم حسین چہرہ بے پناہ دل کشی لیے ہوئے تھا۔ اتنا ذخیرہ سارا وقت گزرنے کے باوجود وہ جیتن تھی، وقت کی رفتار سوائے سہ کے بالوں کے کہیں اور نہ دیکھی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نظریں اُس کے پر نور چہرے سے نہ ہٹا سکے، دل نے ملامت کی۔

”وجاہت علی! قدرت نے فیاضی سے بنایا ہوا شاہکار تمہیں عطا کیا تھا، اور تم نے غور سے دیکھا کب نہیں تھا۔“ ”بیران ہیں آپ کہ جسے جوان اور توانا چھوڑ گئے تھے وہ بڑھی اور کمزور ہو گئی ہے۔ صاف کرنا اسی بات کی میں حفاظت نہ کر سکی کیوں کہ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔“ وہ نرم سی مسکان چوڑی زدہ ہونٹوں پر سما کر بولی۔

”کچھ نہ سوچیں کہ سوچتے سوچتے تیرہ سال گزر گئے، ہو سکے تو آگے کی بات سوچیں۔“ وہ ان کا ہاتھ اچک کر دھیرے دھیرے بولی۔

”آ..... آگے کیا ہے؟“ وجاہت علی ہلکاتے ہوئے بولے جیسے بچو نے ڈنگ

”کچھ نہ سنی! آج تو ہے۔ آج تو آپ میرے پاس ہیں، آج تو آپ کو کھڑکی سے نہیں جانا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کھڑکی سے جاؤں یا دردازے سے! اہا تو یہاں رہنے کی ہے۔“ وہ نگاہیں جھکا کر بولے۔

”تو رہیے ناں۔ لایے میں آپ کے کُتے اُتار دوں۔“ اُس نے ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر کُتے کو کھینچنے کی کوشش کی تو وہ جھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیوں..... کیوں پارسائی کی دیوی بننے کا شوق ہے تمہیں۔“

”میرا منصب تو دقاری ہے۔“ وہ ہر ساری سے فرش پر بیٹھے بیٹھے بولی تو وہ مضطرب سے ہو کر کھڑکی میں کھڑے ہو گئے۔ سرد رات بے ہاتھ سے کھڑکی کا جالی دار پردہ سرکا کر شیشے سے پار دیکھنے لگے، ایسا لگا جیسے کسی نے ہاتھ کی کھڑکی کھول کر سب پڑانے منظر تازہ کر دیے ہوں اس کمرے سے تو بچپن، جوانی اور نادانی کی سب داستانیں جڑی تھیں انھوں نے گردن گھما کر کمرے میں چاروں طرف نگاہیں گھمائی تو ایک ایک چیز سے نگاہ کھرا کر فرش پر بیٹھی حرمت پر جا کر ٹک گئی۔ وہ سچ سچ تابعداری کا مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔

”یہ سچ ہے کہ ٹم نے وفا کی، یہی سچ ہے کہ تم نے تابعداری کی، رات کے اندھیرے میں مجھے یہاں سے جانے کے مواقع فراہم کیے۔ صبح کے اُجالے میں میرا مجرم رکھا۔ مگر یہ بھی تو سچ ہے تم بااکی پسند اور ضد کی عقل میں لائی تھی تھیں۔ بابائے ماہ پارہ کو میرے لیے حرام قرار دے دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اُس کی محبت میں سرتا پیر گرفتار تھا۔ ماہ پارہ کے پیروں کے تھکھڑ و میرے ارادے کی زکات نہ بن سکے تھے۔ تم نے میری محبت کی قوت اور طاقت کا اندازہ لگا کر مجھے ماہ پارہ سے ہٹے رہنے کی راہ دکھائی۔ مگر میں تمہارا مجرم نہیں تھا۔“ وہ غصے اور افسوس کی کئی غلی کیفیت کا شکار تھے۔

”کیا میں نے کبھی شکایت کی، آپ ماہ پارہ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے اجنبی کے رچاؤ و حسا کے رنگ اور پھولوں کی مہک میں ڈوبے جا رہا ہوں، ان دنوں میں دفن کر دیے اور پھر کبھی آپ سے اُن کا حساب بھی نہیں مانگا۔ بااکیہ نہیں سکتے تھے اس لیے ہم دونوں کا مجرم قائم رہا، آپ انھیں صبح کا سلام کرتے تھے تو وہ کھل اٹھتے تھے۔ رات آپ کے باہر گزارنے کی خبر بھی میں نے نہیں دی، یہاں تک کہ ریم کا کاؤ گھر کے کس ملازم کو بھی نہیں بتایا چلے دیا۔“

میں کھلائے و جاہت ملی کو چھوٹا کیا۔ وہ جج جج چوٹے اور کپ تمام کیا۔
 ”چھوٹے صاحب! آپ نے اچھا کیا جو میری زندگی میں آگے در نہ جو بوجھ دل و
 دماغ پر تھا میرے ساتھ قبر میں آتا جاتا۔“ رحیم کا کا قالین پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ دجاہت نے
 تحیر آمیز نگاہوں سے انھیں دیکھا اور حیران کن کپ پ ساہلی۔
 ”آپ پوچھیں گے نہیں کہ کیا؟“
 ”نہیں۔“ بڑی گہرائی سے انکی آواز آئی۔
 ”نہ آپ پوچھتے ہیں اور نہ خرمت بنی پوچھتی ہے، میرے دل کا بوجھ بڑھتا ہی
 جا رہا ہے۔“

”رحیم کا! اس انگلیڈ سے صرف ایک مہینے کے لیے آیا ہوں۔“ وہ بیکسر ان کی
 بات ٹال گئے یا پھر سمجھ نہ سکے۔ رحیم کا کا نے طنز یہ مسکرا کر انھیں دیکھا، اسی اثناء میں خرمت
 گرم گرم کباب لیے اندر داخل ہوئی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”میں چلتا ہوں رات گہری ہو گئی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔
 ”یہ..... یہ کباب میں نے خوشی سے تلے ہیں پلیز۔“ خرمت نے مت بھرے لہجے
 میں کہا۔

”پلیز! شرمندہ نہ کرو۔“ وہ کچھ قائلے پر ہو کر بولے۔ جب رحیم کا کا نے کہا۔
 ”چھوٹے صاحب! شرمندگی کا تو زمانہ کب سے گزر گیا اب تو پیچھا دوے کا دور
 ہے۔“ رحیم کا کا کی بات پر وہ ہلچلی کرنے لگے۔
 ”خرمت! پلیز بات سمجھا کرو، مجھے قطعاً غلب نہیں ہے۔“ انھوں نے تقریباً
 جھڑک کر کہا۔

”آج آپ میرے پاس رہیں، پلیز میری خوشی کے لیے۔“ خرمت نے دھیرے
 سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بدک کر پیچھے ہو گئے۔
 ”چھوٹے صاحب! یہ نہیں جانتی کہ آپ تو ایک زمانہ ہوا اس کی خوشی ایک طوائف
 کے قدموں پر قربان کر چکے ہیں۔“

رحیم کا کا! مقام پہنچا ہے اپنا، دوسرے بچوں کی ماں ہے، میری محبت ہے۔“ دجاہت
 ملی کو گویا جتنے لگ گئے تو رحیم کا کا نے بھی دل کا غبار نکلانے میں کسر نہ چھوڑی۔

”آپ بابا سے آخری بار کب ملے تھے؟“ اس نے پوچھا تو وہ چپ رہے۔
 ”میں یاد دلاتی ہوں، جب بابا پر فالج کا ایک ہوا تھا اور آپ انگلیڈ جانے کی
 اطلاع سنا کر گئے تھے اس کے بعد بابا زندہ تو رہے مگر اندر ہی اندر.....“
 ”بس..... بس! آگے کی سب کہانی مجھے پتا ہے۔“ وہ سخت بے زاری سے
 بولے، خرمت نے غور سے دیکھا دجاہت ملی کے چہرے اور لب و لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا
 تھا۔ سوائے گزری عمر کے نشانات کے۔ وہ پگ ہو گئی۔
 ”رحیم کا کا کہاں ہیں؟“ انھوں نے پوچھا۔
 ”شاید کچن میں۔“ اس نے دھیرے سے کہا تو وہ اس کے لہجے کی یاسیت محسوس کر
 کے کچھ نرمی سے بولا۔

”کرائے دار اچھے لوگ ہیں ناں۔“
 ”جی! رحیم کا کا کے جاننے والوں نے کسی کی سفارش کی تھی۔ اچھے لوگ ہیں آپ کا
 پوچھتے ہیں، میں نے بتا رکھا ہے کہ آپ انگلیڈ میں ہیں۔“
 ”کوئی تنگی وغیرہ۔“ وہ انھیں سے کچھ اپنے اپنے سے بے تو خرمت کے چہرے پر
 یقین کی روشنی پھیل گئی۔ وہ دجاہت ملی کی داہنی پر دل میں خوش تھی۔
 ”آپ آگے ہیں تو کوئی پریشانی نہیں رہی۔“
 ”لیکن مجھے جانا ہے۔“ وہ زرخ موڑ کر دروازے کی طرف بڑھے تو مین اسی وقت
 رحیم کا کا چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آگئے۔ دجاہت ملی گڑبوا گئے۔
 ”سلام چھوٹے صاحب!“ وہ سنجیدگی سے رحیم کا کا کے سلام کے جواب میں گردن
 ہلا کر بیٹھے ہو گئے۔

”رحیم کا کا! کھانے کے لیے تو کچھ لاتے۔“
 ”میں کباب لے کر آتی ہوں۔“
 خرمت رحیم کا کا کے دلی جذبات سے ناواقف کمرے سے باہر نکل گئی تو ان دونوں
 نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رحیم کا کا نے چائے بنا کر ان کی طرف کپ بڑھایا تو وہ بولے۔
 ”مجھے چائے کی طلب نہیں ہے۔“
 ”مگر مجھے یہی خبر ہے کہ آپ کو چائے کی طلب کب نہیں ہوتی۔“ رحیم کا کا نے گود

حرمت اُن کے سامنے آگئی۔

”آج نہ جائے پلیر! آج رُک جائے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں ہونے دوں گی۔“

”خرمت! اُم نے پہلے کبھی ایسے نہیں روکا اور اب..... انھوں نے براہ راست اُس سے مخاطب ہو کر جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ وہ درر کبیں نکل گئی۔

”دل تو بہت چاہتا تھا، مگر آپ کی خوشی میں میری خوشی تھی۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کراہ آیا نہیں ہو سکتا۔“ وہ دوسرے سے بولے۔

”ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، دیکھئے ہر چیز آپ کے انتظار میں ہی سنوری ہے۔ آج کی رات اُن سب کا انتظار امر کر دیجیے پھر بے شک چلے جائے، میں اس دروازے سے بچھ دوں گی۔ اب کوئی نہیں پوچھے گا۔“ حرمت اپنی دلی کیفیت سمجھتے ہوئے اُس کی ہاتھوں پر ہاتھ پٹتی جب کہ وہ پھر بے تکلفا ہونٹ دانتوں سے دبائے کھڑے تھے۔ انھیں اُس کی وقار پر کال بلیں تو تھا مگر اس جنوں پر حیرت زدہ تھی تھی۔

”آئیے نا۔“ حرمت نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو انھوں نے ہنسنے سے ہاتھ پھیرا لیا۔

”آج ایسے دل نہ توڑیے۔“ اُس نے معصوم نظروں سے التجا کی تو وہ مجبوراً سے کرسی پر ٹک گئے۔

”دگرزے وقت کو داہیں لانے کی کوشش مت کرو۔“

”وجاہت! آپ تو میرا آج ہیں، میری یہ دُعا تھی کہ آپ جب بھی لوٹ کر آئیں گے وہیں سے میرا آج شروع ہوگا۔“ وہ رمان سے بولی۔

”تو جان لو کہ تمھاری دُعا تو عمل نہیں ہوئی کیوں کہ ایسا ممکن ہی نہیں۔“ وہ سپاٹ اور سیدھے انداز میں بولے۔

”نانا کہ راہ پارہ آپ کی محبت سے ہیں آپ سے وہ محبت نہیں مانگ رہی، میں تو صرف اپنے لیے اپنی تکمیل چاہتی ہوں۔“

”خرمت! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم محبت بھی کر سکتی ہو۔“ وہ کچھ بے دلی سے بولے تو وہ سر ہلایا احتجاج بن گئی۔ ”یہ محبت کیوں ہے؟ میرے تیرے برسوں کی تڑپ کا آپ کو کوئی احساس نہیں، کب میں نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہے، بولے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، جو تڑپ تم سینے سے لگائے بیٹھی ہو وہ تو کب کی قسم

”صاحب! کیسا انصاف ہے یہ! ہم مرد یہ شرف دینے پر آمین تو بازاری عورتوں کے قدموں میں جنت رکھ دیں، اگر عزم کرنے پر آمین تو نیک پارسا باقا عورتوں کو بانجھ بنا دیتے ہیں۔“

”رجیم کا! میں یہاں تقریریں نہیں آیا۔“ وہ کافی خجندی سے بولے تو خرمت نے جلدی سے اُن کا مزاج بحال کرنے کی کوشش کی۔

”رجیم کا! آپ بھی کیا ذکر لے کر بیٹھے، وجاہت آگئے ہیں تو میرے لیے یہ شرف بھی کافی ہے۔“

”بیٹی! ہم اتنے سادہ دل ہو چھیں اندازہ ہی نہیں کہ مرد کتنی پستی میں گر سکتا ہے۔ تمھاری محبت اور وفاداری اور تابعداری کی ان کی نظر میں کی قیمت نہیں تھی۔“ رجیم کا کاٹنے چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے کہا تو وجاہت علی نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ انھیں دیکھا۔

”رجیم کا! کیا یہ سب بابا کی خند کا کیا دھرا ہے اب گڑے مُردے اُٹھانے سے کیا حاصل۔“

”بہن تو میں کہہ رہا ہوں کہ اتنے عرصے بعد کیسے آنا ہوا؟“ رجیم کا کاٹنے کے لیے میں حد درجہ طنز بھرا تھا جسے محسوس کر کے وجاہت علی حسب مزاج غصے میں آگئے۔

”یہ میرا گھر ہے یہاں مجھے آنے سے کون روک سکتا ہے، جانا تو کسی اور کو چاہیے تھا۔“ وہ دانستہ نظروں میں آ کر بولے تو رجیم کا کاٹنے کی طرف سے ہنس دیے۔

”معلوم ہے، لیکن آپ جسے کہہ رہے ہیں وہ لاعلم ہے۔“

”آپ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ خرمت پریشان ہو کر بولی۔

”بیٹی! لیکن پر بوجھ نہ ڈالو! آج چھوٹے صاحب سب سمجھا کر جائیں گے۔“

رجیم کا کاٹنے درذیہ لگا ہوں سے وجاہت کو دیکھا اور کمرے سے باہر نکل ملے۔ جب خرمت پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ رجیم کا کاٹنے باتوں پر توجہ نہ دیں، دراصل انھوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے میری بہت میں آپ سے شکوہ شکایت کر رہے تھے۔“

”مجھے جانا ہے، بہت ڈسٹرب ہو گیا ہوں میں۔“ وہ پہلو بچاتے ہوئے بولے تو

ہوئی، اسے زمانے گزرنے کے بعد یہ بچپنا اچھا نہیں لگ رہا۔ "ان کی بے حسی پر اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"میرے ارمان - گزرے وقت کے ہر پل نے انھیں مرے اندر جوان رکھا ہے۔" وہ ان کی بات کا جو مطلب بھی اس کی روشنی میں روتے ہوئے بولی۔

"خیر میں سچ سچ کچھ نہیں سمجھ پا رہا، مجھے جانا ہے، پلیز!" وہ آگے بڑھے تو وہ منت پر آتر آئی۔

"آج نیک جائے، یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے۔"

"حیرت ہے کہ تم کچھ مجھے کی کشش کیوں نہیں کر رہیں، وہ بات منوانا چاہتی ہو جس کا تھوڑی سی مجال ہے۔ میں یہاں اگلا نمبر دیکھنے کی غرض سے آیا ہوں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بحالی کا کوئی راستہ باقی ہے۔" انھوں نے انجینیت کی ہر منزل طے کر لی، وہ تب بھی اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ جانے کیا سوچ کر ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھی پھر اس کی دروازہ کھول کر نرسنگ ٹیبل ڈیوے ٹیبل کے ان کے قریب آگئی۔

"دو جاہت ایہ دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"ہوہہ!" وہ بے دلی سے بولے۔

"یہ وہ انگلی ہے جو شادی کی رات آپ مجھے دے کر گئے تھے۔ یہ آج تک میں نے پہنی نہیں جانتے ہیں تاکہ کیوں نہیں پہنی؟" وہ کھوے کھوے کھنکھولنے لگی۔ "یہ تمہیں پہننے کے لیے دی تھی، پہن لیتی چاہیے تھی۔" دو جاہت نے پھر سخت لہجے کا سہارا لیا۔

"یہ یہی تھی مگر پہناتی تو آپ کو چاہیے تھی۔"

"کیا بچوں جیسی باتیں کرنے لگی ہو، اسے عرصے زبان کاٹ کر وفاداری کا ڈرامہ کرتی رہیں آج اپنے مقام سے کیوں گر رہی ہو؟"

"آپ میری حسرت ناقص کے اظہار کو مقام سے گرنے کا نام دے رہے ہیں؟" خیرت کی آنکھیں پھر میرے گیسے تھیں تو وہ زنج ہو گئے۔

"فارما سیک! اس مغلغل میں ڈالنا چاہتی ہو، ہوش کے ناخن لو۔"

"آپ کا یہ انداز مجھے یاد ہے گا۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔

"حسرت! میں تمہاری نیک نامی، پارسی کا معترف ہوں مگر گزرنے وقت نے جو

فیصلے کر دے ہیں انھیں تسلیم کرنا ہوگا، میں اب بہت عرصے بعد شاید کبھی پاکستان آؤں، مجھے اعلیٰ طرفی کے ساتھ معاف کر دینا۔" انھوں نے کافی زرخوئی کا مظاہرہ کر کے قدم دروازے کی طرف بڑھائے تب وہ تیزی سے سامنے آگئی۔

"یہ تو بتا کر جائے کہ دروازہ کھلا رکھوں یا کھڑکی۔"

"اوہ میرے خدا! خیر مت ہلکان ہو، بلاؤ رحیم کا کا کو، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" وہ کافی اشتعال میں آگئے۔

"میں نے فقط یہ پوچھا ہے کہ دروازہ کھلا رکھو یا کھڑکی۔" وہ ایک ہی جگہ چبے ساکت ہو گئی تھی۔ دو جاہت کو ناقابل یقین صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا انھیں گمان تک نہیں تھا کہ دیوار پر لگی تصویر کی طرح خاموش اور ساکت رہنے والی حرمت اسے برسوں کے بعد یوں بیدار ہو جائے گی۔

"دیکھو! یہ طے ہے کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے، دروازہ کھلا رکھو یا بند! مجھے اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بہتر تو یہ تھا کہ تم بہت پہلے کھڑکی دروازے سب کھول کر تازہ ہوا کو اندر آنے کا موقع دیتیں۔ اب بھی بہت زیادہ خرابی نہیں ہوئی ہے، سوچو تو۔" انھوں نے سرتا سرتا دیکھا اور جملہ نامکمل چھوڑ کر دروازہ کھولا۔

"سمجھ نہیں آتا کہ آپ کی اس سوچ پر اعتبار کروں یا اپنی وفا شعاری پر یقین رکھوں۔" وہ حد درجہ طویل ہو کر دروازے کا ایک پٹ تھام کے کھڑکی ہو گئی۔

"دیکھو! بار وفاداری جتنا نے کی ضرورت نہیں، میں نے وفاداری کا پورا نہ سہی کچھ نہ کچھ تو حق ادا کیا ہے۔" وہ جیسے لہجہ میں بولے تو اسی لمحے رحیم کا دروازے کے درمیان اکڑے ہوئے۔

"صاحب! آپ درست کہہ رہے ہیں مگر آپ کی اس وفاداری کی قیمت سے یہ ناواقف ہے۔ قسم لے لیں جو یہ معصوم کچھ بھی جانتی ہو، اگر جانتی ہوئی آپ اس کرے کے باہر کجاہ میں بات کرتے۔" رحیم کا کانے خیرت کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ حیرت بخشا ہوا ہو گئے۔

"میں نے یہاں آکر غلطی کر لی ہے شاید۔"

"نہیں صاحب! آپ نے اچھا کیا جو آگے ورنہ میرے دل پر جو بوجھ تھا وہ

کیسے اترتا، بھلائی میں ہی کسی مگر کی کو لا علم رکھنا گناہ ہے۔ اب تیرہ سال کے ڈرامے کو ختم ہونا چاہیے۔

”رحیم کا کا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں ایسا نہیں چاہتی۔“ خرمت جذباتی ہو کر چلائی۔

”یہی اتم خاموش رہو، ظالم مرد اپنی مرضی سے فیصلے کرتے ہیں، کب تم جیسی بیویوں سے پوچھتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ کیا کر چکے ہیں؟“ رحیم کا کا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وجہات علی مشتعل ہو گئے۔

”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی فلم دیکھ رہا ہوں، جانے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ دونوں۔“

”کچھ نہیں صاحب! یہ لفاظی آپ اپنے ہاتھ سے خرمت سے لے کر آپ کو لے کر آئی ہیں۔ آٹھ سال سے میں اسے سنبھال کے گناہ گار ہو رہا ہوں۔“ رحیم کا کا نے ایک خاکی تہہ شدہ لفاظی کو پکڑا تے ہوئے کہا تو وہ سناٹے میں آ گئے۔

”یہ..... یہ تمہارے پاس۔“

”جی ہاں! میں نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ کیوں کہ ایک معصوم کی آس اور امید میں اس طرح ختم نہیں کر سکتا تھا۔ شاید مرتے دم تک میں یہ خرمت کو نہ دے سکتا۔“ رحیم کا کا نے بہت عجیبی سی اعتراف کیا۔

”یہ تو خرم ہے کہ کسی کی امانت کو اپنے پاس رکھ لیا جائے۔“ وہ ہٹلائے۔

”ایسی امانت آپ ہی دے سکتے ہیں مجھ میں یہ حوصلہ نہیں تھا۔“ رحیم کا کا بھی ڈٹے رہے۔ وہ کبھی اُن کو دیکھتے اور کبھی ہاتھ میں پکڑے لفظ کو۔ ”میں شرمندہ ہوں مگر مجرم نہیں، ایسا مجبوری کے تحت ہوا پھر مجھ میں نے اس میں تلافی کی کوشش کی تھی۔“ وہ صفائی دینے کو بولے۔

”وہ تلافی اس طرح اس میں محفوظ ہے، لفاظی سکول کر دیکھ لیں۔ آپ نہ مجرم ہیں نہ ظلم! اب اس معصوم کی قسمت میں لے لکھا تھا۔“

رحیم کا کا نے جذبات چھپانے کی کوشش کی مگر خرمت گولگی کیفیت سے نکل کر بولی۔

”یہ سب کیا ہے؟ آپ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”یہی! مجھے امید ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح آج بھی صبر اور حوصلے سے کام لو گی۔“ یہ کہہ کر رحیم کا کا تیزی سے کمرے سے باہر چلے گئے جب کہ وجہات علی پریشان تھے کہ اس موقع پر کیا کریں۔

”آپ بولے! یہ لفاظی کیا ہے؟“

”یہ رکھ لو، بعد میں دیکھ لیتا۔“ انھوں نے نظریں پڑائیں تو وہ منہر ہو گئی۔

”پلیز! آپ بتائیے نا!“

”کہا تو ہے کہ تسلی سے دیکھ لیتا۔“ وہ ٹال کر پھر دوراز سے کی طرف بڑھے۔

”آپ کو کونسی اسے اور دیکھیں، میری سمجھ میں رحیم کا کا کی باتیں نہیں آرہیں۔“ وہ اُن کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی تو وہ جھٹکے سے ڈور ہو گئے۔

”یہ لفاظی آٹھ سال پہلے میں نے انگلیٹھ سے سمجھا تھا۔ اس کے تحت تمہارے اور میرے بیچ اب کچھ باقی نہیں، میں نے مجبوری کے تحت ایسا کیا تھا، ماہ پارہ کی ضد تھی؟“ وہ اور جانے کیا کہتے مگر خرمت تیزی سے رخ موڑ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”ہا! آپ نے میرے نام تھنڈ خن کار دہی سمجھا تھا۔ رحیم کا کا نے واقعی گناہ کیا، یہ امانت تو فوراً اچھے دوئی چاہئے تھی تاکہ اسے عرصے میں کسی ناخبرم کے خواب و خیال سے پاک صاف رہتی۔“

”انھوں نے تمہاری بہتری کے لیے ایسا کیا۔“ وہ اس کی پشت پر آ کر بولے۔

”ٹھیک ہے، جو بھلائی آپ نہ کر سکے اُس کی توقع دوسروں سے ہی کی جاسکتی تھی۔“ وہ کرخت اور گرج دار آواز میں بولی تو پہلی مرتبہ وجہات علی کے قدم لرزے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں، میں نے پانچ لاکھ کا چیک لکھا تھا۔“

”تاکہ میں بھوکے نہ رہوں، آپ نے دیکھا نہیں کہ رحیم کا کا نے آپ کی امانت کس قدر دیانت داری سے سنبھال رکھی تھی۔“ چیک لے جائیں صرف وہ تھنڈ چھوڑ جائیں۔“

وہ کچھ اور فاصلے پر چلی گئی اور سر پر پھیلا دوپٹا اچھی طرح سمجھ کر چہرے پر ڈال لیا۔

”خرمت!“

”ھدارا! آپ باتیں کر رہے ہیں، مجھے اور گناہ گار نہ کیجئے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”کاش! میں گزراؤقت واپس لا سکتا۔ مگر۔“

آپ دلیلوں سے خود کو ہراساں نہ کریں، سمجھیں کہانی ختم ہوئی۔“ اُس نے درمیان میں ٹوکا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ ”مجھ سے بھول ہو گئی، جو میں یہاں چلا آیا۔“

”اب، آپ یہاں سے جانے میں دیر نہ کریں، میں اپنے اللہ کے حضور گناہ گار بن رہی ہوں۔“ حرمت نے ایسے سادہ اور سپاٹ لہجے میں کہا کہ وہ بوجھل قدموں سے دروازہ پار کر گئے، اُن کے قدموں کی آواز لُحظہ بہ لُحظہ دور ہوتی گئی۔ اُس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ کر اپنے رب سے اُس گناہ کی توبہ کی جو وہ انجانے میں کرنے لگی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد کمرے کا منظر بدل گیا۔ کھلی کھڑکی سے تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے اُس نے ہُد سکون ہو کر بھیگی پلکیں صاف کیں۔ بستر کی سفید چادر اُتار کر دوسری رنگین چادر بچھائی، گل دان میں لگے سرخ گلاب نکال کر ایک کونے میں رکھ دیئے کہ اب کسی چیز کی بھی اہمیت باقی نہ رہی تھی..... ہجر و وصال کے سب موسم گزر گئے تھے..... کوئی ارمان اور آرزو باقی نہ بچی تھی..... وفا اور پار سائی نے شکست کھائی تھی..... اُس نے دروازہ بند کر لیا کہ سب سلسلے ٹوٹ گئے تھے۔





راحت و فنا کے افسانے حقیقت کے قریب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ”مہر کے پاؤں“ ایک حقیقت ہیں یا جیسے ہر حسن میں کہیں نہ کہیں بد صورتی کی موجودگی ایک حقیقت ہے۔ راحت و فنا نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ خواب محض خواب ہوتے ہیں اور ان کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ قاری کو خوابوں کی دنیا میں لے جانے کی بجائے حقیقت سے روشناس کراتی ہیں اور حقیقت خوابوں کے مقابلے میں بہر حال بہت تلخ ہوتی ہے۔

رضی الدین رضی